مشرق کی طرف دیکھ

مشرق بعید کے اہم ممالک جاپان، کوریا، ملائیشیا، تھائی لینڈ و دیگر کا سفرنامہ

عامر بن علی

مشرق کی طرف دیکھ

(سفرنامہ)

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310
E-mail: nastalique786@gmail.com

Mushriq ki Tarf Dekh
by
Amir Bin Ali
Published by
Nastalique Matbuat

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : مشرق کی طرف دیکھ
مصنف : عامر بن علی
سرورق : تصویر حسن عابد
بارِاوّل : اپریل 2024ء
کمپوزنگ : عبدالستار
تعداد : 2000
مطبع : حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
قیمت : -/1000 روپے
بیرونِ ملک: -/10 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات: F-3 الفیر وز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310

انتساب

خاندان کے نئے جوڑے

مریم اور غماز حسنین

کے نام

حسن ترتیب

دیباچہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آمنہ مفتی

حصہ اول

پورب کا دروازہ کھلا

☆ شکستہ ظروف کا سنہرا سفر 14

☆ نحوست 17

☆ سماج کا باطن اور گیشا 21

☆ کسٹمر سروس 25

☆ ٹیکنالوجی کے کرشمے 29

☆ سمندروں کے سفر پہ نکلو 32

☆ پت جھڑ کی چاپ 36

☆ تلوار کی واپسی اور توشہ خانہ 39

☆ سابق جاپانی وزیراعظم کا قتل 42

☆ ٹوکیو اولمپک 2020 46

☆	عوامی سواری	49
☆	رزق ضائع مت کریں	52
☆	جاپان پر ایٹمی بمباری کی یادیں	55
☆	اک نگری دور افتادہ۔۔ پیکا	58
☆	تھائی لینڈ کی ایک صبح	62
☆	تھائی انتخابات	65
☆	مائی سوت اور روہنگیا	69
☆	جنوبی کوریا میں کیا دیکھا	73
☆	کوریا کی ایک جھلک	78
☆	ساخالینی کورین	82
☆	قوس قزح کے رنگوں سے مزین ملائیشیا	86
☆	یہ دیس ہے میٹھے لوگوں کا	90
☆	ملائیشیا نامہ	94

حصہ دوم

نیرنگِ خیال

☆ زبانِ یار کے اوجِ کمال کا نسخہ 100

☆ بین الثقافتی ہم آہنگی کی عالمی ضرورت 104

☆ کس برہمن نے کہا تھا یہ سال اچھا ہے 109

☆ ایک تھا گورباچوف 112

☆ براہموس میزائل کا میاں چنوں گرنا 116

☆ نئی سحر کی امید 120

☆ پاکستان کی معاشی گراوٹ اور عالم دیگر 123

☆ کتاب سے بہتر کوئی جلیس نہیں 127

☆ یکساں نصابِ تعلیم۔دوسرا رخ 131

☆ روس یوکرین جنگ کا پس منظر 134

☆ روس یوکرین جنگ کا ایک سال 138

☆ پریگوژن اور قلبِ عالم کا نظریہ 142

☆ میاں میر کا عرس اور حساس تقرری 146

☆ غلط فہمیوں کا تدارک 149

☆ سفرنامے کا ارتقاء اور لندن 152

☆ آنے والے سنہرے ایام کے نام 156

حصہ سوم

یادِ یاراں

☆ محبت کا فلسفی شاعر رخصت ہوا 161

☆ استادِ محترم شعیب ہاشمی 166

☆ اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے۔اجمل نیازی 170

☆ جی بسم اللہ اختر شمار 173

☆ منشاء یاد کا فن اور شخصیت 177

☆ احمد ندیم قاسمی کی یادیں 180

☆ قائم نقوی۔اک چراغ اور بجھا 184

☆ ستارے دیکھتے رہنا 187

☆ ظفر دل والا 190

دیباچہ

عامر بن علی سے ملاقات ہوئی تو شمہ برابر بھی خیال نہ آیا کہ یہ شخص ادیب بھی ہوسکتا ہے۔نہ کسی نے تعارف کرایااور نہ ہی ہم نے کریدا۔مگر پھراچانک ہی کچھ اسباب پیدا ہوتے چلے گئے کہ عامر سے یکے بعد دیگرے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ہرملاقات میں ایک ہی تاثر گہرااورمزید گہرا ہوتا چلا گیا کہ آدمی معقول ہے۔فی زمانہ کسی آدمی کا معقول ہوناہی بہت بڑی صفت ہے۔تو خیر یہ معقول آدمی جب بھی ملتااس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی ہی نہیں پیا،ان اجنبی بستیوں کی کہانیوں سے بھی جھولی بھرلی ہے۔عامر کے پاس کمال کی بدیشی کہانیاں ہوتی تھیں۔ان کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ کسی بھی جگہ کے ایک آدھ دن کے ہنگامی دورے کے بعد لکھی گئی پانچ سو صفحے کی کتاب کی بجائے سالہا سال سے ان ممالک میں رہنے،ان کی زبان سیکھنے اوران کے ساتھ کاروبار کرنے کے بعد کہی جاتی ہیں۔

ابھی ہم عامر کی کہانیوں کے طلسم میں ہی گم تھے کہ ان کی کتاب'' مشرق کی طرف دیکھ''موصول ہوئی۔کتاب کا عنوان دیکھ کر یورپ میں جگہ جگہ لگے کولمبس کے مجسمے یاد آ گئے۔جس میں وہ مشرق کی طرف انگلی سے اشارہ کررہا ہے۔عامر بھی چھوٹے موٹے کولمبس یا کم سے کم مارکوپولوتو نکلے ہی۔مسودے کی ورق گردانی شروع کی تو مکمل کرکے ہی اٹھی۔زبان کا تو یہ ہے کہ ہم خود خاصی لچھے دار زبان بول لیتے ہیں اس لئے عامر کی خوبصورت نثر سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔جو چیز ہمیں لے بیٹھی وہ عامر کی جاپان کی تہذیب وثقافت پہ عبور ہے۔اپنی روانی میں وہ ہمیں مشرق کے اسرار بتاتے

جاتے ہیں جیسے کوئی فلسفی بادام کے شگوفوں سے لدے درخت کے نیچے بیٹھا گیان بانٹ رہا ہو۔

عمر بھر جاپان کی ٹیکنالوجی کی برتری تسلیم کرنے والوں کے لئے یقیناً یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یہ لوگ روحانی طور پہ بھی ہم سے بہت آگے ہیں۔توہمات، رویات، ادب آداب، یہ سب کسی قوم کی تہذیب، اس کی فطری نشوونما کو ظاہر کرتی ہے۔بغیر کوئی لمبا بھاشن دیے، سادہ تحریر میں عامر نے جاپانی معاشرے کی کتنی ہی کہانیاں کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی ہیں۔عین اسی طرح جس طرح وہ عام گفتگو میں روس سے چلی، چلی سے ٹوکیو اور ٹوکیو سے میاں چنوں کی کہانیاں جوڑتے جوڑتے درمیان میں اقبال ٹاؤن کی بودوباش کا ذکر بھی کر جاتے ہیں۔اس کتاب میں نہ تصنع ہے اور نہ ہی قاری کو مرعوب کرنے کی شعوری کوشش، ایک سلاست اور روانی ہے۔قاری اس صفت سے خود ہی متاثر ہو جائے تو اور بات ہے۔پڑھنے کی چیز ہے، یاد رکھنے اور اوائل بہار کے دنوں میں جب کچھ بھی پڑھنے کو دل نہ چاہ رہا ہو تو کچنار کے کاسنی پھولوں کی خوشبو کے جلو میں یہ کتاب بار بار پڑھی جا سکتی ہے۔

آمنہ مفتی

لاہور

حصہ اول

پورب کا دروازہ کھلا

شکستہ ظروف کا سنہرا سفر

صوفی درویش سے گھریلو خاتون خانگی مسائل پر گفتگو میں مگن تھی۔اپنے خاوند سے اس عورت کو بہت ساری شکائیتیں تھیں۔کسی طور پر بھی وہ مصالحت پر آمادہ نہ تھی۔بزرگ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ازدواجی رشتوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ایک ساتھ پڑے برتن بھی ٹکرا جاتے ہیں۔اپنا بستا ہوا گھر مت توڑو۔خاوند کو معاف کر دو۔مفاہمت ومصالحت سے کام لو۔خاتون مگر غصے میں تھی۔شوہر نے اس کا دل توڑا تھا،اس کا اعتماد مجروح کیا تھا۔کہنے لگی شیشہ ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر نہیں جڑ سکتا۔دل کے آئینے میں ایک بار بال آجائے تو پھر وہ دور نہیں ہوسکتا۔اس پر دانا بزرگ نے خاتون کو مثال دی کہ جاپان میں ٹوٹے ہوئے شیشوں کو جوڑنے کا ایک فن ہے۔ٹوٹا ہوا کانچ کا برتن اور آئینے کو سونے ،چاندی ودیگر قیمتی دھاتوں کو پگھلا کر جوڑا جاتا ہے۔ٹوٹ کر جڑے ہوئے یہ برتن پہلے سے زیادہ قیمتی ہوجاتے ہیں۔پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کہانی کا انجام تو الگ موضوع ہے مگر اسے سننے کے بعد میں جب بھی جاپان میں کہیں شیشے اور سرامک کے کسی ٹوٹے برتن کو سونے، چاندی، پلاٹینم سے جڑا ہوا دیکھتا ہوں تو ٹھٹھک جاتا ہوں۔انسانی رشتوں کے ساتھ ان شکستہ برتنوں کی تشبیہہ خوبصورت بات ہے۔ان ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنے اور قیمتی دھاتوں سے ان میں آئے بال کو پر کرنے کا فن یہاں فنون لطیفہ میں شامل ہے۔اسے ''کھن سگی'' کہا جاتا ہے۔اس لفظ کی تشریح میں ہی ایک جہان آباد ہے۔سنہری مستقبل،طلائی آئندہ،سنہری مرمت،طلائی جوڑ،سنہرا سفر بھی بڑا مناسب ترجمہ ہے۔اس فن کے لئے

ایک لفظ سونا بنانا بھی مستعمل ہے۔صدیوں پرانا یہ فن فقط فنون لطیفہ کا حصہ نہیں بلکہ ایک گہرا فلسفۂ حیات ہے۔یہ استعارہ بھی ہے ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے اور انسان کو خوبیوں کے علاوہ نقائص سمیت قبول کرنے کا۔اپنی ذات کی کجیاں،کمیاں،عیب قبول کرتے ہوئے جینے کا حوصلہ و ہنر۔انسان فانی ہے،اور شکست کھا جاتا ہے،اس کے باوجود شخصیت کے عیب قبول کرتے ہوئے محبت کرنے والے کی صلاحیت اور رغبت۔یہ موضوع اتنا وسیع مفہوم و معانی رکھتا ہے کہ اس پر بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

اردو شاعری کے توسط سے اس بابت جو ناقص معلومات ہم تک پہنچی ہیں،ان کا خلاصہ تو کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

جن برتنوں سے خوبصورت یادیں وابستہ ہوں ان کے ٹوٹنے کا دکھ اس لئے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان یادوں کے فراموش ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ایسے شکستہ ظروف کے لئے ''دکھن سگی''مسیحائی کا عمل ہے۔ظروف کو ٹوٹنے کے بعد بھی قابل استعمال اور عزیز رکھنے کی خواہش جاپانیوں میں بہت قدیم ہے۔اس کی جڑیں مذہبی و روحانی،سلسلے زن ZEN مسلک سے بھی منسلک ہے۔جس کے نزدیک بدصورتی اور بھدا پن بھی متاثر کن ہے۔شکستہ ظروف میں خوبصورتی تلاش کی جا سکتی ہے۔یہ دراڑیں برتن کو اور زیادہ قیمتی بنانے کا سبب بھی ہو سکتی ہیں۔اس فن میں جدت اور خوبصورتی پیدا کرنے کا سبب پانچ صدیاں پہلے رونما ہونے والا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔جب ایک ''شوگن'' نے اپنا چائے کا ٹوٹا ہوا پیالا مرمت کے لئے چین بھیجا۔

دھات کی دھاروں سے مرمت ہونے کے بعد جب یہ پیالا واپس جاپان پہنچا تو بہت

بھدا لگ رہا تھا۔''شوگن'' کو بے حد مایوسی ہوئی۔اب شوگن کیا ہوتا ہے؟ یہ ہزار کتابوں کا موضوع ہے۔اس نام سے عالمی شہرت یافتہ ناول بھی موجود ہے۔مگر اس وقت میں اس کا ترجمہ''سورما'' کر کے آگے بڑھتا ہوں۔آپ صلیبی عہد کے نائٹ سمجھ لیجئے۔اس واقعے نے جاپانی کاریگروں کو تحریک دی کہ کیسے شکستہ ظروف کی دراڑوں کو خوبصورتی کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے پر کر کے انہیں دوبارہ قابل استعمال بنایا جائے۔پانچ صدیوں کے ارتقاء کے بعد آج ہم اس فن کو بام عروج پر دیکھتے ہیں۔ایک سے

ایک جدید ورکشاپ ہے جو ٹوٹے ظروف کو طلائی جوڑ لگاتی ہے۔اب تو اگر شکستہ جام وصراحی کا کوئی گمشدہ ٹکڑا بھی ہو تو جدید تکنیک کی مدد سے اسے بنالیا جاتا ہے۔کلی، لاک، لاکا سے سے یہ عموماً ٹکڑے بنتے ہیں۔اہل پنجاب نے کسی زمانے میں گلی محلے میں یہ آواز ضرور سنی ہوگی۔

''پانڈے کلی کرالو''

جن لوگوں نے یہ آواز کوچہ وبازار میں نہیں سنی انہوں نے سریلے غزل گائیک مہدی حسن کا اس موضوع پر مشہور زمانہ گیت ضرور سن رکھا ہوگا۔میرا مقصد ٹوٹے برتنوں کو قیمتی دھاتوں سے جوڑنے کا طریقہ بیان کر کے آپ کو بور کرنا نہیں ہے۔غم، بیماری، کرب، حادثے اور دیگر اندوہناک واقعات کے بعد تعمیر نو کا حوصلہ اور خود کو نقصانات کے بعد بکھرنے سے بچانے کا یہ استعارہ ہے۔مغربی جرائد نے کرونا نے بچھڑنے والوں کے کرب سے سمجھوتہ کر کے آگے بڑھنے کی ہمت کے باب میں بار بار''کھن سگی'' کی مثال دی ہے۔ذہنی امراض کا شکار افراد بھی جب بحالی کا سفر شروع کرتے ہیں تو اہل مغرب انہیں اسی سنہری جوڑ کو علامت بناتے ہیں۔یہ استعارہ انسانی زندگی، رشتوں اور دنیا کی بے ثباتی کے باوجود آگے بڑھنے کا ہے، یہ فقط ایک لطیف فن نہیں جوشِ نمو کے حوصلے کی تلمیح ہے۔ٹوٹے ہوئے رشتوں میں خوبصورتی تلاش کرنے کی ہمت وحوصلے کی علامت ہے۔

نحوست

یہ اگست کا مہینہ تھا جب آج سے 32 برس قبل گلگت کے ائیر پورٹ سے ایک پی آئی اے کی مسافروں سے بھری پرواز نے اسلام آباد کے لئے اڑان بھری۔ یہ بدقسمت فلائیٹ کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچی۔ ایسے لاپتہ ہوئی کہ آج کے دن تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا، کہ اسے آسمان کھا گیا، یا پھر زمین نگل گئی۔ اس پرواز کا واقعہ پڑھتے ہوئے فلائیٹ نمبر 4 0 4 اور اس میں سوار 54 مسافروں کا ذکر پڑھ کر میں رک گیا۔ اس کی وجہ جاپان میں چار کے ہندسے سے منسلک نحوست کا تصور ہے۔ بات اس طرح سے کی جائے تو زیادہ واضح ہو جائے گی کہ جاپان میں کسی فلائیٹ کا نمبر یہ نہیں ہوسکتا۔ عمومی طور پر سائنس وٹیکنالوجی کو توہم پرستی کی ضد سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جو معاشرے مادی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوتے چلے جاتے ہیں وہاں روحانیت کمزور اور توہم پرستی مٹتی چلی جاتی ہے۔ جوں جوں ٹیکنالوجی سماج میں پھیلتی ہے نحوست کا تصور مدھم پڑھتا چلا جاتا ہے۔ انہی مشرقی عقائد وتصورات میں سے ایک چار کے ہندسے کی نحوست ہے۔

آپ اگر جاپان کی سیاحت کے لئے آئیں اور کسی کثیر المنزلہ عمارت کی لفٹ میں کھڑے ہو کر غور کرنے پر بھی چوتھا فلور نہ تلاش کر پائیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ تین کے بعد جو منزل ہے وہ نحوست سے بچنے کے لئے پانچویں کہلاتی ہے۔ بالخصوص اسپتالوں میں عمومی طور پر چوتھا فلور نہیں ہوتا اور نہ ہی نواں فلور ہوتا ہے۔ 9 کا ہندسہ بھی بدبختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی نحوست 4 کے مقابلے میں کم ہے۔ جاپانی چونکہ تصویری زبان ہے

اور روایتی طور پر قلم کی بجائے برش یعنی ادبی زبان میں موئے قلم سے لکھی جاتی ہے،اس میں چار کے ہندسے کی تصویر اور موت کے حرف کا خاکہ یا نقش ایک جیسا ہے۔یہی وجہ ہے کہ چار جسے ''یون'' کہا جاتا ہے،کوشش کی جاتی ہے کہ اس ہندسے کو ''شی'' پکارا جائے،اول الذکر موت کے لئے بھی مستعمل ہے۔

اس سماج میں رہتے ہوئے آپ ان سماجی تصورات سے پہلوتہی نہیں کر سکتے۔یہ عین ممکن ہے کہ آپ بڑی چاہت سے کسی کو تحفہ پیش کریں اور وہ اسے اذیت ناک موت کی بددعا سمجھے،کئی دوستوں کے ساتھ ایسا ہوا کہ ان کے تحفے کو موت کی بددعا گردانتے ہوئے ترک تعلق کر دیا گیا۔کبھی کسی جاپانی کو ایسا تحفہ نہ دیں جس میں چار یا 9 کا ہندسہ آتا ہو۔تحائف کی تعداد زیادہ ہے تو پھر تین یا پانچ ہی ہوں۔چار قطعاً نہ ہوں۔پھول پیش کرنا چاہتے ہیں تو ان کی تعداد چار قطعی طور پر نہ ہو ورنہ آپ پچھتائیں گے۔جیسے چار موت کا نشان ہے اسی طرح 9 کا ہندسہ اذیت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ایپل کمپنی نے آئی فون 8 کے بعد آئی فون ٹین پیش کیا تھا۔کیوں؟ذرا سوچئے کہ آئی فون 9 کیوں نہیں بنایا گیا؟سات اور آٹھ کے ہندسے البتہ خوش بختی کی علامت ہیں۔سات کا خوش قسمتی کے ساتھ تعلق کا تصور بدھ ازم سے آیا ہے اور آٹھ کا ہندسہ چونکہ کہیں ختم نہیں ہوتا لہٰذا 8 کو امرت،لامتناہی زندگی اور کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔باقی دنیا کی طرح جاپان میں بھی منظّم جرائم ہوتے ہیں،جرائم سے وابستہ افراد کی تنظیمیں جسے ''یاکوزا'' کہتے ہیں۔یہاں پر چھوٹے موٹے جرائم اور انفرادی مجرم بہت کم ہوتے ہیں۔مجرم جرائم پیشہ لوگ مافیا کی شکل میں منظّم جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔بڑے مجرموں کو ''یاکوزا'' کہتے ہیں۔ان کی گاڑیوں کا نمبر عام طور پر 4444 ہوتا ہے۔اس نمبر کا مقصد موت کی توہین کرنا ہوتا ہے۔یہ اعلان کہ میں موت سے نہیں ڈرتا،بلکہ خود موت بانٹتا ہوں۔یہ انڈر ورلڈ اتنا دلچسپ موضوع ہے کہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے مگر اس پر پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے۔عرض کرنے کا مقصد ہے کہ اگر آپ کو کمرہ نمبر 4 نہ ملے یا پھر چوتھی منزل ہی غائب ہو جائے تو آپ نے گھبرانا نہیں۔

ذاتی طور پر اس دقیانوسی تصور سے پالا مجھے اس وقت پڑا جب میں نے یہاں مکان تبدیل

کیا۔کثیرالمنزلہ عمارت زیادہ محفوظ خیال کی جاتی ہے اور اکیلے آدمی کے لئے زیادہ موزوں بھی رہتی ہے۔تیسرے فلور پر فلیٹ تھا اور اس سے اوپر پانچویں منزل۔گاڑی کھڑی کرنے کے لئے پارکنگ کی ضرورت تھی۔پراپرٹی ڈیلر سے اس متعلق بات کی تو اس نے کہا کہ کوئی بھی پارکنگ خالی نہیں ہے۔دوسرے ڈیلر سے پتا کیا تھا،اس نے بھی یہی جواب دہرایا مگر امید کی اس کرن کو جگا گیا،کہ ہاں!مگر تھوڑا سا مسئلہ ہے،ایک پارکنگ موجود تو ہے مگر نمبر چار ہے۔اگلے دس برس چار نمبر پارکنگ پر ہی میں نے گاڑی کھڑی کی اور اب بھی خیریت سے ہوں۔صرف جاپان میں ہی نہیں چین میں بھی چار کا ہندسہ موت کی علامت اور منحوس خیال کیا جاتا ہے۔سی پیک سے متعلق لوگ اور چین کے ساتھ کاروبار کرنے والے یقیناً جانتے ہوں گے۔چین میں بھی توہم پرستی بہت زیادہ ہے۔ٹی جنکشن پر کبھی دوکان نہیں بنائیں گے اور نہ ہی کوئی دیگر کاروبار کھولیں گے۔واقفان حال بتاتے ہیں کہ کسی چینی کو آپ ایسی جگہ دیں جہاں سڑکیں ٹی بناتی ہوں تو وہ مفت میں بھی نہیں لیتا ہے کہ اس کی نحوست دیر تک پیچھا کرتی ہے۔میں تو اسے ضعیف الاعتقادی ہی کہوں گا چونکہ میاں چنوں کا ٹی چوک تو شہر کا سب سے مصروف کاروباری مرکز ہے اور وہاں سب دوستوں کی دوکانیں خوب چلتی ہیں۔خلیفہ پان شاپ پہلے یہاں ایک تھی،اب اس کی دو برانچیں کھل گئی ہیں۔خیر چینیوں سے کیا شکوہ۔پورا یورپ ہی 13 کے ہندسے کو منحوس سمجھتا ہے۔

ہندو مذہب میں ٹوٹا ہوا آئینہ اور شیشہ برا شگون خیال کیا جاتا ہے اور اسے گھر میں رکھنا منحوس سمجھتے ہیں جبکہ گھڑی کی سوئیاں اگر ٹھہر جائیں تو یہ بھی اھشگن خیال کرتے ہیں۔ہندوستانیوں کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ آپ سب لوگ خوب جانتے ہیں،روسیوں کی سنئے،روسی بہت کم مذہبی ہوتے ہیں۔کیمونزم کے خاتمے اور سوویت یونین کے انہدام کے باوجود مذہب کی طرف واپسی کا رجحان وہاں فروغ نہیں پا سکا۔میری اسکول کے زمانے سے زبان سے سیٹی بجانے کی عادت ہے۔روسیوں کے ساتھ کاروباری مراسم ہیں۔مجھے حیرت ہوتی ہے جب بھی کوئی کوئی روسی مجھے دفتر میں بالخصوص سیٹی بجاتے دیکھتا ہے تو ضرور منع کرتا ہے۔کہتے ہیں'' پیسے نہیں آئیں گے''مزید کہ سب مال چلا جائے گا،سیٹی مت بجاؤ ورنہ کاروبار تباہ ہو جائے گا۔

توہم پرستی کا ایک پہلو جاپان اور پاکستان میں مشترک ہے اور وہ کالی بلی کے متعلق ہے۔کالی بلی اگر رستہ کاٹ جائے تو اسے نحوست کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ماضی میں سنا ہے کالی بلی اگر آگے سے گزر جاتی تو لوگ سفر کا ارادہ ترک کر دیا کرتے تھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جاپان کی سب سے بڑی نجی کوریئر کمپنی

کا نام ہی کالی بلی ہے، اور اسکا مونوگرام بھی کالی بلی کے منہ میں اس کا کالا بچہ ہے۔یعنی ڈاک ترسیل کی اس کمپنی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ تو سب کا راستہ کاٹ جاتی ہے مگر اس کا راستہ کوئی بھی نہیں کاٹ سکتا، جو بھی اس کا راستہ کاٹے گا اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔نحوست کے یہ تصورات صرف سماجی اور زبانی، کلامی حد تک ہی نہیں ہیں۔اگر آپ کی گاڑی میں بلی بھی مرگئی ہے تو سمجھیں اس کی قیمت آدھی رہ گئی ہے، گاڑی بیچتے وقت یہ بتانا ضروری ہے کہ اس میں کسی جانور کی موت ہوئی ہے، ایسی گاڑی یا گھر کو جس میں کسی نے خودکشی کر لی ہو''سا گی'' کہتے ہیں، قانونی طور پر فروخت کے وقت یہ معلومات چھپانا جرم ہے۔ایسے گھروں اور گاڑیوں کو لوگ خود ہی اونے، پونے، سستے داموں بیچ کر نحوست سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سماج کا باطن اور گیشا

جاپان کے باطن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ یہ تجزیہ جاپان میں ربع صدی اردو پڑھانے والے پروفیسر تبسم کاشمیری کا ہے اور میری نظر میں حرف بہ حرف حقیقت ہے۔ پہلے پہل تو ہر سیاح یہی تاثر لیتا ہے کہ جاپانی بہت بھولے ہیں، کسی حد تک یہ بات درست بھی ہے، مگر کبھی کبھی کچھ لوگ بھولے پن کی اداکاری بھی کرتے ہیں۔ سب کچھ جاننے کے باوجود ظاہر یہ کرتے ہیں جیسے ان کو کچھ بھی نہیں پتا۔ دسویں بار بھی وہی واقعہ سنتے ہوئے اسے یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ ان کی سماعت میں آیا ہے۔ تنقید بالکل بھی نہیں کرتے۔ آپ کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کہیں کہ آج موسم بہت اچھا ہے تو 99% امکان یہی ہے کہ جواب میں یہی کہا جائے گا کہ واقعی آج موسم بہت اچھا ہے۔ پھر آپ اسی جگہ اسی وقت کسی دوسرے آدمی سے کہہ دیں کہ آج موسم بڑا خراب ہے تو پھر بھی 99% امکانی جواب یہی آئے گا کہ ہاں! ہاں!! آج موسم واقعی ذرا خراب ہے۔ اختلاف رائے کے اظہار کا یہاں عمومی طور پر رواج نہیں ہے۔

میرا نیپالی دوست جس کے دیسی کھانوں کے یہاں کئی ریستوران ہیں، اپنے کاروبار کے بارے میں گپ شپ کر رہا تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ ہم دیسی لوگ شکایت بہت کرتے ہیں، کھانے میں یہ کم ہے، وہ زیادہ ہے، یہ مسئلہ ہے، وہ گڑبڑ ہے، اس سے برعکس جاپانی گاہک اچھے ہیں کہ کوئی شکوہ شکایت نہیں کرتے، چپ کر کے کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ وشنو سرن نیپالی کا تجزیہ اور استدلال بالکل الگ تھا۔ کہنے لگا کہ بھائی صاحب! ہمارے لوگ پھر بھی اچھے ہیں، وہ کھانے میں نقص نکالتے

ہیں تو ہمیں اپنا معیار بہتر بنانے میں اور کمی، کوتاہی دور کرنے میں اس سے مدد مل جاتی ہے۔ جاپانی گاہک کھانا کھا کر مزیدار، مزیدار!! کی صدا بلند کر کے چلے جاتے ہیں، چاہے کھانا برا اور پھسپھسا ہی بنا ہو۔ مگر دوبارہ پلٹ کر نہیں آتے ہیں۔ یہ رجحان ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہے۔

بنیادی طور پر جاپانی بڑے شرمیلے ہوتے ہیں۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا لیجئے کہ جاپانی زبان میں جنسی عمل کے لئے کوئی لفظ ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ عام گھروں میں میاں اور بیوی کے لئے الگ الگ بستر ہوتے ہیں۔ ہماری شاعر دوست نیلما ناہید دورانی پولیس میں بڑی افسر تھیں۔ دوران ملازمت جاپان ٹریننگ کے لئے گئیں تو اپنے اس قیام کی یادوں کو انہوں نے پنجابی سفرنامے کی صورت میں محفوظ کر دیا ''چڑھدے سورج دی دھرتی'' بہت ہی خوبصورت سفرنامہ ہے۔ عمدہ شاعر اور حرفوں سے آشنائی کے سبب اعلیٰ تحریر کی صلاحیت تو ان کے پاس موجود تھی، اس کے ساتھ ساتھ سیاحوں جیسی متجسس ان کی نظر اور روح نے اس سفرنامے کا مزہ دوآتشہ کر دیا۔ ایک باب انہوں نے کیوٹو شہر کی ''گیشا'' کے متعلق باندھا ہے۔ مختصراً ذکر میں مصنفہ نے ''گیشا'' کا ترجمہ ''وحشیا'' اور زنِ بازاری'' بیان کیا ہے۔ اصل صورت حال ذرا مختلف ہے۔ سادہ ترین الفاظ میں بیان کروں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے طوائف اور پیشہ ور جسم فروش عورت میں فرق ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں طوائف کا بنیادی ہنر عام طور پر اس کی رقص میں مہارت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ''گیشا'' عمومی جسم فروش عورتیں نہیں ہوتیں بلکہ جاپانی تہذیب کا ایک تاریخی استعارہ ہیں۔ روایتی لباس میں ملبوس زبان و بیان پر دسترس اور ثقافتی نزاکتوں سے مکمل آشنائی رکھنے والی یہ خواتین انتہائی اعلیٰ تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ تاریخ کے کسی موڑ پر بھی ان کا مفلس اور عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہمیشہ سے گیشا اشرافیہ کے مردوں کو اپنے الفاظ اور حرکات وسکنات سے لبھاتی آئی ہیں اور بیش بہا انعامات پاتی آئی ہیں۔ ان خواتین کی تربیت کے لئے باقاعدہ سکول ہوا کرتے تھے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اب تو وہ پورا نظام ہی بدل سا گیا ہے، جہاں ان گیشاؤں کی تربیت ہوتی تھی، مگر کہیں کہیں راکھ کے ڈھیر میں اب بھی چنگاریاں باقی ہیں۔ بنیادی طور پر ''گیشا'' روایتی

فنکار خواتین ہیں جو پرفارمنگ آرٹ سے منور نجن کا اہتمام کرتی ہیں۔رقص وموسیقی پر دسترس کے علاوہ انہیں گفتگو کے فن پر مہارت سکھائی جاتی ہے۔یہ خواتین آج کل انتہائی امیر لوگوں کی دعوتوں کا حصہ بنتی ہیں اور کہیں کہیں اسٹیج پر بھی نظر آتی ہیں،اپنے بھاری بھرکم میک اپ اور روایتی جاپانی لباس کے ساتھ ،مگر یہ خواتین جسم فروشی نہیں کرتی ہیں۔

صرف یہ بیان کردینا کافی ہوگا کہ گیشا کا لفظی ترجمہ فنکار شخص ہے اور پہلا گیشا مرد تھا جو چار صدیاں پہلے گزرا۔پہلی خاتون گیشا کوئی تین صدیاں پہلے گزری تھی۔آپ کو حیرت ہوگی کہ چار، پانچ سالہ تربیتی کورس کے دوران گیشا کو کوئی ساز بجانے اور گانے کے علاوہ کیلی گرافی اور آرائش گل کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔زوال کا شکار اس شعبے سے منسلک خواتین کی تعداد کا تخمینہ ایک سے پانچ ہزار تک کا ہے،یاد رہے کہ آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ جاپان میں موجود تھی۔ان دنوں گیشائیں تو فقط مہنگے میکدوں،مخصوص ریستورانوں اور ہزار دو ہزار ڈالر میں چائے پلانے والے چند خصوصی چائے خانوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔

ہم جاپانی سماج کے باطن،ان کی اصل روح اور ثقافتی وانسانی اظہاریوں کا تذکرہ کررہے ہیں۔جاپانی اپنے جذبات کے اظہار کے معاملے میں چونکہ کسر بیانی سے کام لیتے ہیں اس لئے ان کے باطن کو سمجھنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ایک دوسرے کو چھوتے بالکل بھی نہیں ہیں۔ویسے تو زمانہ قدیم سے بہت ساری سلطنتوں میں قانون اور اصول تھا کہ بادشاہ سلامت کو چھونا ممنوع ہے مگر یہاں عام عوام بھی یہی طرز اپنائے ہوئے ہیں۔میرے ایک برازیلی دوست سے اس کے جاپانی استاد نے یہ شکوہ کیا کہ آپ لوگ تو بہت زیادہ ایک دوسرے کو چھوتے ہیں۔ہاتھ ملانے کا تو جاپان میں کرونا وبا سے پہلے بھی رواج نہ تھا،کورنش بجالاتے فرشی سلام ہی یہاں زمانۂ قدیم سے رائج ہیں۔مگر بعض اوقات یہ صورت حال تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔میں نے ایک اسپتال میں یہ دلخراش منظر دیکھا کہ ایک دس بارہ سال کی بچی کی والدہ کا انتقال ہوگیا،اس کی دادی،والد اور چند دیگر اقربا بھی وہاں موجود تھے،بچی رو رہی

تھی،مگر تمام لوگ اسے رونے اور آواز نکالنے سے منع کر رہے تھے،وہ کسی عزیز سے لپٹنے کی کوشش کرتی تو اسے پرسہ دینے کی بجائے خود سے الگ کر کے،صبر اور حوصلہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔اپنے جذبات کے اظہار سے منع کر رہے تھے۔مجھے یہ منظر ذرا سنگ دلانہ لگا مگر ہر خطے کے لوگوں کے اپنے رسم ورواج اور زندگی گزارنے کے الگ الگ ڈھنگ ہوتے ہیں۔انہیں اچھی اور بری ثقافتی اقدار میں تقسیم کرنا شاید مناسب نہیں ہوگا۔رسم رواج اور انداز زیست اچھے اور برے نہیں ہوتے،بس ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔اس عالمِ رنگ وبو کی ثقافتی رنگارنگی ہی اس کا حسن ہے۔سماجی تنوع ہماری دنیا کو مزید خوبصورت بناتا ہے۔جاپانی معاشرے کے گرد تنی پراسراریت کی چادر سے اس سماج اور ثقافت کا حسن مزید دوبالا ہو جاتا ہے۔

کسٹمر سروس

گاہک بھگوان کا روپ ہوتا ہے۔لوک دانش سے بھری یہ مثل صدیوں سے ہندسندھ میں مشہور ہے۔جاپان میں معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے، یہاں مثال مشہور ہے کہ گاہک خدا ہوتا ہے۔یعنی خریدار بھگوان یا دیوتا سمان نہیں بلکہ بذات خود خدا ہے۔ایک دلچسپ پہلو اس بابت یہ بھی ہے کہ یہاں گاہک اور مہمان کے لئے ایک ہی لفظ رائج ہے۔گویا جس طرح مہمان کی عزت اور تکریم کی جاتی ہے، اسی طرح یہاں گاہک کی آؤ بھگت اور عزت افزائی ہوتی ہے۔جاپان میں جیسے ہی آپ کسی دکان یا اسٹور پر جائیں تو اسٹاف کے تمام افراد با آواز بلند خوش آمدید کہتے ہیں۔شروع شروع میں تو بعض سیاح سمجھ نہیں پاتے کہ یہ شور کیوں اٹھا ہے۔رخصت کرتے وقت بھی اجتماعی طور پر ''شکریہ'' کی آواز لگاتے ہیں۔عموماً دفتر کے باہر رخصت کرنے آتے ہیں۔آپ کو فرشی سلام کرتے ہوئے تقریباً رکوع کی حالت میں پہنچ جاتے ہیں۔

کسٹمر سروس کا یہاں معیار اور سطح کیا ہے اس حوالے سے دو ذاتی تجربات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، اس ہڈ بیتی سے آپ کو بہتر اندازہ ہو جائے گا۔یہ گرمیوں کے دن تھے، جاپان پہنچے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔یہاں موسم گرما مختصر ہوتا ہے مگر اس دوران ہوا میں نمی زیادہ اور دھوپ کڑاکے کی ہوتی ہے۔دھوپ کا چشمہ لگانے سے آنکھوں کو راحت محسوس ہوتی ہے۔خاص طور پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے دھوپ اور سائے جب اٹکھیلیاں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ایسے ہی عالم میں دھوپ کا چشمہ ایک دن لگانے کے لئے اٹھایا تو محسوس ہوا کہ یہ لنگڑا ہو چکا ہے۔بغور جائزہ

لیا تو معلوم ہوا کہ ایک عدد پیچ ڈھیلا ہونے کے بعد کہیں گر گیا ہے۔سیاہ چشمہ پہن کر آدمی ولن لگتا ہے اور ایسے عالم میں کسی سے باالمشافہ گفتگو کرنا مجھے بدتمیزی لگتی ہے،مگر گاڑی چلاتے وقت میں چشمہ لگالیتا ہوں۔میری قیام گاہ کے قریب ہی عینکوں کی ایک بڑی دکان تھی۔گھر سے پیدل نکلا کہ ہوا خوری بھی ہوجائے گی اور چشمہ بھی مرمت کروالیتا ہوں۔جیسے ہی میں دکان میں داخل ہوا تو خوش آمدید کا اجتماعی استقبالیہ نعرہ کارکنوں نے بلند کیا۔سب احتراماً کھڑے ہوگئے۔ایک کارکن نے کرسی دونوں ہاتھوں سے سرکا کر مجھے پیش کردی اور بیٹھنے کے لئے کہا۔میز کی دوسری جانب کرسی سیاہ سوٹ ٹائی میں ملبوس نوجوان نے سنبھال لی،میں نے اپنا لنگڑا چشمہ جیب سے نکال کر میز پر رکھا اور اپنا مدعا بیان کیا،اسی اثنا میں ایک خوبرو دوشیزہ سبز چائے لے آئی اور بڑے سلیقے سے میرے سامنے پیش کردی۔میں دل ہی دل میں اس عزت افزائی اور آؤ بھگت کا بل بنا رہا تھا،کہ یہ اہتمام مجھے کتنے روپے میں پڑے گا؟وجہ تو معلوم نہیں لیکن جاپان میں عینکوں کی دکانیں بہت زیادہ ہیں۔سبز چائے کی فرحت بخش پیالی میں نے جیسے ہی ختم کی میرا چشمہ مرمت ہو چکا تھا۔بلکہ مرمت کرنے کے بعد اسے ایک خاص محلول میں دھو کر چمکا دیا گیا تھا۔

کمپنی کی مشہوری کے لئے میری عینک کو ایک بٹوے میں ڈال کر پیش کیا گیا،جس کے اوپر دکان کا نام تحریر تھا۔ایسے چونچلے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ آج تو لمبی ''ڈز'' لگے گی۔ہچکچاتے ہوئے میں نے رخصتی پر مختتانہ پوچھا۔کتنے پیسے ہوئے؟دوشیزہ نے کھلی ہوئی باچھوں والی مسکراہٹ سے جواب دیا''سروس''مطلب کہ مفت خدمت کی ہے آپ جناب محترم کی ہم نے۔بازار سے کوئی چیز اگر آپ نے خریدی ہے اور کسی وجہ سے واپس کرنا چاہتے ہیں،دکاندار آپ سے بس رسید طلب کرے گا،سودا واپس کرنے کے لئے کوئی دوسرا سوال نہیں ہوگا۔یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ رسید کے بغیر کوئی مال بیچنے کا تصور بھی محال ہے اور ہر رسید پر درج مجموعی رقم کا دس فیصد ٹیکس حکومت کو جاتا ہے۔

بھلے دنوں کی بات ہے کہ میرے قریبی دوست نے ایک سنہری گھڑی مجھے تحفے میں دی

تھی۔سوئٹزرلینڈ یاٹ کلب کی ساختہ یہ گھڑی آٹو میٹک تھی۔ یہاں یہ وضاحت برمحل ہوگی کہ آٹو میٹک گھڑیاں خودکار ہوتی ہیں، یعنی ان میں کسی بھی بیٹری سیل ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ہاتھ، کلائی کی حرکت سے یہ خود ہی چارج ہوتی رہتی ہے۔دنیا بھر کی تمام مہنگی گھڑیاں تقریباً آٹو میٹک ہی ہوتی ہیں۔شومئی قسمت کہ مذکورہ گھڑی خراب ہوگئی۔خود ٹھیک کرنے کے جو ٹوٹکے تھے تمام آزما لئے، ایک نیم مکینک کو دکھانے پر بھی نامرادی مقدر ٹھہرا۔اچانک میری نظر اس گھڑی کے ڈبے میں موجود گارنٹی کارڈ پر پڑی جواب تک میرے پاس محفوظ تھا۔اس پر ٹوکیو میں اس کمپنی کے ڈیلر کا پتہ درج تھا، مگر گارنٹی کی معینہ مدت ختم ہوچکی تھی۔یہاں مسئلہ یہ تھا گھڑیاں مرمت کرنے والے مشکل سے ملتے ہیں، جو گھڑی ساز ملتے ہیں وہ مہنگے اتنے ہوتے ہیں کہ تخمینہ سن کر بے اختیار نئی گھڑی خریدنے کو دل کرتا ہے۔وہ بعض اوقات سستی محسوس ہوتی ہے۔ویسے تو یہاں جوتے مرمت کروانے کا بھی یہی حال ہے۔موچی منہ مانگی اجرت طلب کرتے اور وصول پاتے ہیں۔جوتا مرمت کروانے سے بہتر ہوگا کہ آپ دو نئے جوڑے اسی قیمت میں خرید لیں مگر جوتوں کے اسپتال کا ذکر پھر کبھی کریں گے۔کلائی کی گھڑی کے بارے یورپی اقوام میں یہ بدگمانی اور توہم پرستی پائی جاتی ہے کہ گھڑی کا تحفہ محبت کرنے والے دو دلوں میں رنجش اور جدائی کا سبب بن سکتا ہے۔بعض اہلِ مغرب میں یہ رسم بھی موجود ہے کہ عشاق بچھڑتے وقت آخری تحفہ گھڑی کا دیتے ہیں۔گھڑی کا تحفہ کچھ یورپ کے ممالک میں علیحدگی کی خواہش کا اظہار بھی سمجھا جاتا ہے۔میرا معاملہ چونکہ اس قسم کا جذباتی نہیں تھا، اس لئے میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ گھڑی کی گارنٹی کی مدت عرصہ پہلے ختم ہوچکی ہے، جاپان میں اس کمپنی کے ڈیلر کو بذریعہ ڈاک اس کے اصلی ڈبے میں ڈال بھجوادی کہ ''بنی تو بنی، نہیں تو عبدالغنی'' ذہن میں گم ہونیکا اندیشہ تو موجود تھا مگر سوچا کہ یہ چلتی تو پہلے بھی نہیں ہے اس لئے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوگا۔

چند دن بعد مجھے اس کمپنی کے جاپانی ڈیلر کا فون آیا۔بڑے مؤدب انداز میں مخاطب ہوا کہ ہم نے کوشش تو کی ہے کہ آپ کی گھڑی یہیں پر ہی مرمت کردی جائے مگر یہ ممکن نہیں ہوسکا۔اس کو سوئٹزرلینڈ بھیجنا پڑے گا۔کیا آپ اجازت دے سکتے ہیں؟ میری طرف سے کھلی چھٹی دے دی گئی چونکہ وقت بتانے سے یہ قاصر تھی، ہمارے برہمن دوستوں کا کہنا اس بابت یہ ہے کہ رکی ہوئی گھڑی اور ٹوٹے ہوئے شیشے

کو گھر میں نہیں رکھنا چاہیئے، یہ اپشگن ہے، براشگون ہوتا ہے۔ دو ماہ کے بعد ایک صبح میں دفتر پہنچا تو ایک پارسل میرا منتظر تھا۔ کھولنے پر سوئٹزرلینڈ کی کمپنی یاٹ کلب کا ایک نیا ڈبہ، اسے کھولا تو میری وہی پرانی مرمت شدہ گھڑی موجود تھی۔ گھڑی کی اسکرین گویا نئی محسوس ہو رہی تھی اور چمڑے کے نئے اسٹریپ پرانوں کی جگہ تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں اس ڈبے میں گھڑی کھولنے کے آلات بھی موجود تھے اور تہنیتی کارڈ، جو کمپنی کی طرف سے یہ پیغام دے رہا تھا کہ آپ کو یہ مفت سہولت فراہم کر کے ہمیں بے حد خوشی محسوس رہی ہے۔ حالانکہ اصل خوشی تو مجھے محسوس ہوئی تھی۔ بقول شخصے جاپان میں گاہک اگر رشتہ داری کرنے تک کا بھی کوئی منصوبہ یا تجویز پیش کر دے تو اسے صاف انکار نہیں کیا جائے گا۔ امید واثق ہے کہ مدعا الیہ مشاورت کے لئے وقت مانگے گا۔ ہوسکتا یہ کہے کہ بظاہر مشکل کام دکھائی دیتا ہے یا پھر اس کا جواب تو میں پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔

ٹیکنالوجی کے کرشمے

اس حیرت کدے کی عجیب وغریب باتیں کہیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی ہیں۔ٹیکنالوجی اورخصوصاً الیکٹرونکس میں جاپان کی مہارت اور جدت پسندی کی ساری دنیا معترف رہی ہے۔کبھی کبھی مگر یہ خیال ذہن میں آتا ہے، جب کسی جدید اور بڑے الیکٹرک سٹور پر جائیں، کہ اس سے آگے ترقی کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔شائد اس میدان میں انسان نے جہاں تک پہنچنا تھا، وہاں پہنچ چکا ہے، یہ نقطۂ معراج ہے برقی آلات کی ایجادات وجدت کا جو ہمیں اپنے اردگرد نظر آرہے ہیں۔پھر اچانک کوئی نئی چیز اس بابت آتی ہے جو حیرتوں کے نئے باب کھول دیتی ہے۔تازہ خبر تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی اور مجھے یقین ہے آپ کے ذہن میں کسی امکان کے خانے میں بھی نہیں ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ اب آپ ٹی وی پروگرام دیکھنے اور سننے کے علاوہ چکھ بھی سکیں گے۔جھٹکا دینے والی خبر ہے مگر حرف بہ حرف درست اور سو فیصد سچ۔اس ایجاد کے بعد ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے رنگ برنگے کھانے، پھل، سبزیاں اور مناظر کو آپ اسکرین چاٹ کران کا ذائقہ محسوس کرسکیں گے۔تفصیل اس محیرالعقول ایجاد کی کچھ یوں ہے کہ ایک جاپانی پروفیسر نے ایک ایسا پروٹوٹائپ ٹیلی ویژن ایجاد کیا ہے جس کی اسکرین پر دس مختلف ذائقوں کا مخصوص اسپرے کیا گیا ہے۔اس فلیٹ ٹی وی اسکرین پر جیسے ہی کوئی تصویر ظاہر ہوتی ہے، اس کے ساتھ ہی اس کا ذائقہ ابھر آتا ہے، جسے زبان سے اسکرین چاٹ کر محسوس کیا جاسکتا ہے۔نام بھی اس نئی ایجاد کا موجد نے خوب رکھا ہے ''ٹیسٹ دی ٹی وی (TTTV)''، یعنی ''ٹی وی چکھو''۔اپنی ایجاد کی بابت پروفیسر میاشیتا کا کہنا تھا کہ اس ایجاد کا مقصد

لوگوں کو دنیا کے دوسرے کنارے پر موجود کسی ریستوران میں کھانا کھانے کا تجربہ گھر بیٹھے محسوس کرنے کی استعداد دلانا ہے۔ مذکورہ پروفیسر اور اس کے تیس طلباء کی ٹیم اس سے پیشتر کھانا کھانے کا ایسا کانٹا بھی ایجاد کر چکی جو مختلف طرح کے ذائقے فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ یہ کانٹا بھی برقی آلہ ہی ہے مگر اس کا انسانی صحت پر کوئی مضر اثر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد ذائقہ دار ایجادات کا سہرا اپنے سر سجانے والے اس پروفیسر کا کہنا تھا کہ مذکورہ چکھنے والے ٹیلی ویژن کا کمرشل ماڈل مارکیٹ میں ڈیڑھ لاکھ پاکستانی روپے میں دستیاب ہوجائے گا۔ پروفیسر نے مزید یہ کہا کہ COVID-19 کے زمانے میں جب انسانی رابطے اور بیرونی دنیا سے کے ساتھ میل جول مشکلات کا شکار ہے، ایسے عالم میں ٹیسٹ دی ٹی وی (TTTV) گھر بیٹھے بٹھائے آپ کو اردگرد کے ماحول سے جوڑنے کا ایک وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، جو آپ کو ایک نئی طرز سے باہر کی دنیا سے جوڑے رکھنے کا سبب بنے گا۔

متذکرہ پروفیسر صاحب کے ارادے بہت بلند ہیں۔ وہ یہاں پر بس کرنے والے نہیں ہیں۔ اگلا منصوبہ ان کا یہ ہے کہ آئسکریم اور پیزا بیچنے والی کمپنیوں کے وہ ڈیجیٹل مینیو تیار کرنے جا رہے ہیں۔ تاکہ گاہک خریدنے سے پہلے ہی آئسکریم کا ذائقہ اور پیزا بھی چکھ کر آرڈر کرے۔

دوسری خبر اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور شائد اہمیت کے اعتبار سے زیادہ اہم ہے۔ کسی طویل تمہید کے بغیر عرض یہ ہے کہ جاپان میں ڈوئل موڈ گاڑی کا افتتاح کر دیا گیا ہے۔ یہ نہ صرف جاپان بلکہ دنیا بھر میں پہلی گاڑی ہے جو ڈوئل موڈ ہے۔ یعنی سڑک پر بھی چلتی ہے اور ریلوے لائن پر بھی دوڑتی ہے۔ سادہ الفاظ میں ایسی گاڑی ہے جسے آپ چاہیں تو بس کہہ لیں، چاہیں ریل گاڑی کہہ دیں۔ سڑک پر جاتے ہوئے یہ آپ کو بس دکھائی دے گی جس کی حد رفتار 100 کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ براستہ سڑک یہ ربڑ کے عام ٹائروں سے چلتی ہے، کوئی بھی خاص فرق دکھائی نہیں دیتا مگر جب یہ ریلوے انٹرچینج پر چلنے کے لئے پہنچتی ہے تو اندر کی جانب موجود فولادی پہیے ریل ٹریک پر آجاتے ہیں۔ ریل گاڑی کی صورت میں اس کی حد رفتار ذرا کم ہے، یعنی 60 کلومیٹر فی گھنٹہ۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ہماری بسوں کے پیچھے حد

رفتار 65 کلومیٹر لکھا ہوتا ہے، جو کسی زمانے میں رفتار کی قانونی حد رہی ہوگی، پاکستان کی شاہراہوں پر، رسم چلی آ رہی ہے کہ بس جب دوبارہ رنگ وروغن کر کے نئی دلہن کی طرح سجائی جاتی ہے تو اس پر حد رفتار بھی وہی روایتی لکھ دی جاتی ہے۔ مذکورہ ڈوئل موڈ گاڑی ٹرام کے طور پر بھی چلائی جا سکتی ہے چونکہ اس کے تمام پہیے کنٹرول کئے جا سکتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مستقبل میں یہی ریل گاڑی اور بس کا ملغوبہ پوری دنیا میں مسافتیں طے کرتا نظر آ رہا ہے۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

سمندروں کے سفر پہ نکلو

لاطینی امریکہ کے مچھیروں کا کہنا ہے کہ سمندر ایک عورت ہے۔لہروں کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ جب یہ ساحل کی طرف آتی ہیں تو خوشیاں ساتھ لے کر آتی ہیں،اور جب واپس سمندر کی طرف پلٹتی ہیں تو غموں کو اپنے ساتھ سمندر میں بہا کر لے جاتی ہیں۔شاید یہ امید اور عقیدہ ہی ساحل کی طرف آنے کی وجہ بنا۔خیر سمندر کی طرف آنے کے اسباب میں چھٹی کا دن اور ذہنی فراغت بھی شامل تھی۔بحرالکاہل کے جس ساحل کے کنارے آج دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھا ہوں یہ لاطینی امریکہ سے کم ازکم دس ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے،مگر آج جاپان کے مضافات میں اس دور افتادہ ساحلی بستی میں پہنچتے ہوئے میں نے جو مشترکہ چیز محسوس کی وہ ساحل کی ہوا میں رچی بسی ایک سی خوشبو ہے۔میں نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر کے ہوا کے لمس کو اپنے چہرے پر اور ساحلی ہوا کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا تو ایک لمحے کے لئے تو بالکل یہی احساس ہوا جیسے میں چلی،پیرو یا ارجنٹینا کے کسی ساحل پر کھڑا ہوں۔ہوا میں رچی بسی ویسی ہی نمکین نمی کا احساس ہزاروں میل دور سمندر کے دوسرے کنارے پر بھی ہوتا ہے۔سمندر کے پانی کا رنگ،اس کی جھاگ اڑاتی منہ زور لہریں اور مخصوص نمکین ذائقہ بھی بالکل ویسا ہی ہے۔یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ دیگر سمندروں کا رنگ،خوشبو،ذائقہ الگ ہے۔یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا ہر سمندر کی اپنی فضا ہے اور مخصوص آب وہوا کے علاوہ آبی حیات اور ساحلوں پر پائے جانے والے چرند و پرند تک مختلف ہیں۔

سمندر کبھی کبھی بیمار بھی ہو جاتا ہے۔جیسا کہ ابھی آپ سے لاطینی مچھیروں کا تذکرہ کیا،ان

کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سمندر ایک زندہ چیز ہے۔ساگر کو ناری قرار دینے کا سبب تو طویل عرصے تک لہروں کے رحم وکرم پر رہنے اور خواتین سے ماہی گیروں کی دوری بھی ہوسکتی ہے۔مگر سمندر کے بیمار ہونے کی دلیل کے طور پر میرے دوست سرخیو آلیخاندرو راویرو نے سمندر میں مجھے ایسی جگہیں دکھائیں، جہاں پانی زرد رنگت اختیار کئے ہوئے اور ٹھہرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔اس کی وجہ اس نے مجھے فضائی آلودگی اور وہ آلائشیں بیان کیں جو ہم انسان سمندر برد کر دیتے ہیں۔ہم مچھلیاں پکڑنے گہرے سمندر میں گئے تھے مگر مچھلی تو کیا اس کا کوئی نومولود بھی ہمارے ہاتھ نہ آیا۔اس کی وجہ ہماری بے ہنری کے علاوہ اس دن سمندر میں غیر معمولی حرکت تھی، پانی میں حرکت زیادہ ہو تو مچھلی پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہم ماہی گیری کے لئے تاخیر سے نکلے تھے، ماہر مچھلی مار علی الصبح فجر کے وقت نکلتے ہیں۔مجھے تو نامراد خالی ہاتھ گھر لوٹنے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا، سرخیو کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ سویرے گھر میں اعلان کر کے نکلا تھا کہ ہم مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں، ہماری واپسی تک ہنڈیا کا مصالحہ اور دیگر لوازمات تیار رکھیے گا، آج ہمارے ہاں مچھلی ہی پکے گی۔

اس مشکل کا بڑا آسان حل یوں ڈھونڈ لیا گیا کہ مچھلی منڈی کا رخ کیا، جو کہ عین ساحل پر ہی واقع ہے۔وہاں سے سرخیو نے تین بڑی بڑی سنہری مچھلیاں خریدیں اور گھر پہنچتے ہی بیوی ،بچوں کو بتایا کہ سمندر سے ابھی تازہ پکڑ کر لائے ہیں۔اہل خانہ نے شک وشبہ سے بالاتر ہو کر، اسے ایک عظیم مچھیرا قرار دے دیا، اس کے قابل رشک کارناموں میں آج کی ماہی گیری بھی شامل ہوگئی۔مسئلہ تب پیدا ہوا جب اس کے ناخلف بیٹے نے پاکستانی دوستوں کے درمیان بیٹھ کر اس دن کا تذکرہ کر دیا جب اس کے والد سنہری مچھلی پکڑ کر لائے تھے۔''دورادو''نسل کی مچھلی کا لفظی ترجمہ یہی بنتا ہے، ہمارے مقامی مچھیرے ہوسکتا ہے اسے کسی اور نام سے پکارتے ہوں۔پاکستانی دوست چونکہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ کیسے مچھلی پکڑے بغیر لوٹنے کی خفت مٹانے کے لئے سرخیو نے ،مچھلی منڈی سے سنہری مچھلیاں خریدی تھیں اور وہی گھر لے کر گیا تھا، اس لئے انہوں نے اصل صورت حال گوش گزار کرنے کے علاوہ تمسخر بھی اڑایا۔بیٹے کو ناخلف قرار دینے کی وجہ البتہ دوسری ہے، جو کہ الگ

مضمون کی متقاضی ہے، کہ کیسے اس نے باپ کی پچاس ملین ڈالر کی کمپنی دیوالیہ کرواکے ایک ریستوران کھولا، پھراس ریستوران کودیوالیہ کرواکے اب کسی اور کے ریستوران میں باورچی کی نوکری کررہا ہے۔لوک دانش سے بھرپور ضرب المثل یاد آتی ہے۔

؎ پوت سپوت تو کیوں دھن سوچے

پوت کپوت تو کیوں دھن سوچے

اصل دولت تو اولاد ہی ہوتی ہے، اسی کے لائق اور نالائق ہونے پر منحصر ہوتا ہے کہ خاندان کا مستقبل کیسا ہوگا۔ ویسے زیادہ موزوں تو یہاں پنجابی کی مثال محسوس ہوتی ہے کہ بیوقوف بیٹے کی پیدائش سے نابینا بیٹی کی ولادت بدرجہا بہتر ہے۔

؎ ییّل پت نہ جمّے دھی انّی چنگی

ساحلوں کی ریت ایک جیسی خوشبو پیدا کرتی ہے مگر سیپیاں الگ الگ دیسوں میں مختلف انواع واقسام کی ہیں۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ساحلوں کی خوشبو سے مراد بحرالکاہل کی ساحلی خوشبو ہے۔ بحراوقیانوس اور بحرہند کے ساحلوں کی خوشبو قطعی مختلف ہے۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ہر سمندر کی خوشبو منفرد اور بے مثال ہے۔اس کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت پر اثرات بھی مختلف ہیں۔ ہمالیہ کے دامن سے اٹھ کر جاپان آنے والے ایک نیپالی دوست نے اپنی آمد کا سبب یہ بیان کیا کہ بحرالکاہل کی ہوا سے اس کا جسم زیادہ مضبوط اور اعصاب پر اس مہا ساگر کی ہوا مثبت اثرات مرتب کرے گی۔ان میں نئی توانائی بھرنے کا موجب بنے گی۔ مگر جلد ہی ہمیں محسوس ہوا کہ وہ اپنی بیگم سے جس درجہ خوف کھاتے ہیں، بحرالکاہل کی ہوا کیا، سات سمندروں کی ہوا اوران کا پانی مل کر بھی اس کمزوری کا علاج نہیں کرسکتے۔جس کا وہ شکار تھے، بقول شخصے وہ کسی جسمانی کمزوری کا نہیں بلکہ زن مریدی کا شکار تھے۔جو ان کے نزدیک لاعلاج مرض ہے۔

طالب علموں کے لئے عرض کرتا چلوں کہ ہماری دنیا کا 70 فیصد حصہ سمندروں پر مشتمل ہے اورباقی تیس فیصد خشکی ہے۔سمندروں کا ذکر کریں تو بحرالکاہل سب سے

بڑا اور پھیلا ہوا سمندر ہے۔اس کے بعد بحراوقیانوس اور بحرہند کا نام آتا ہے۔میں نے سات سمندروں کا تذکرہ محاورتاً کیا ہے، چونکہ دنیا میں ان کی اصل تعداد ذرا مختلف ہے۔ادب اور تاریخ کی کتابوں میں مگر یہ سات شمار کیے جاتے ہیں۔نویں صدی عیسوی میں عرب مصنف یعقوبی نے لکھا ہے کہ چین پہنچنے کے لئے سات سمندروں کو پار کرنا پڑتا ہے۔عالمی سطح پر الیعقوبی کے نام سے مشہور عرب جغرافیہ دان اور مصنف ،جو بنوعباس کے عہد میں گزرے ہیں،ان کو دنیا بھر میں عالمی ثقافت کا پہلا تاریخ دان قرار دیا جاتا ہے۔ویسے تو کھینچ تان کر،شمالی،جنوبی تقسیم کر کے سات سمندر بنا دیے جاتے ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔البتہ یہ حقیقت ہے کہ ہماری زمین پر پائے جانے والے مجموعی پانی کا 97 فیصد انہی سمندروں میں موجود ہے۔سمندری لہروں کی آواز مجھے تو بے حد پسند ہے،ایک لمحے کو تو سحر طاری کر دیتی ہے۔ناقابل بیان ذہنی سکون محسوس ہوتا ہے جب لہروں کو ساحل کی طرف آگے بڑھتے اور پھر واپس سمندر کی طرف پلٹتے دیکھتے ہیں۔مجھے نوبل انعام یافتہ شاعر،سفارت کار اور سیاست دان پابلو نرودا یاد آ گئے،اپنی جلاوطنی کے کچھ مہینے انہوں نے اٹلی کے جزیرے کیپری میں گزارے تھے۔وطن واپسی کے بعد اس نے کیپری میں اپنے دوستوں سے فرمائش کی تھی کہ جزیرے کے ساحل پر جا کر سمندر کی لہروں کو آواز ریکارڈ کر کے اسے بھیجی جائے،ایک ترقی پسند دوست نے کامریڈ نرودا کی یہ خوبصورت فرمائش بخوبی پوری کر دی تھی۔

پت جھڑ کی چاپ

خزاں کے موسم نے دھرتی کے سینے پر دستک دے دی ہے۔مغربی دنیا میں زرد پتوں کے علاوہ ''ہیلوئین'' کا تہوار بھی اس رت کی پہچان اور امتیازی نشان ہے، جو کہ اب کچھ ہی دنوں کی دوری پر ہے۔ویسے پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات و واقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80%) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔پہاڑ بھی سرسبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خورد و نوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔کہیں ٹولیوں کی شکل میں کسی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ ''ہنامی'' کا لفظی ترجمہ پھول تکنا ہے۔خزاں کے رنگ بدلتے ،گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔یوں کہہ لیجئے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو''مومی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں'' نارا'' عہد کہتے ہیں،اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو''زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔پسِ دیوار زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے،اس نظارے کا سبب ستر ہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروکار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پروہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے،زرد،خشک،نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔میپل کو اردو اور فارسی میں''افرا'' کہتے ہیں۔مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطی کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول،کم از کم میں نے

کبھی نہیں دیکھے تھے۔اسی لیے مجھے شوکمار بٹالوی کا''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی۔مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے،پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے،اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا،جن پر لدے،پھندے،پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کئے جا رہے تھے۔پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں،جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب،آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل وحرکت محدود ہو جاتی ہے۔پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گردونواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے،اور ثقافتی وسماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

تلوار کی واپسی اور توشہ خانہ

تاریخ کے ہمیشہ دورخ ہوتے ہیں، ہمیں کوشش کرنی چاہئیے کہ دوسرے فریق کی بات بھی سنیں۔جغرافیائی سرحدوں اور ذاتی تعصّبات ونظریات سے اوپراٹھ کر بھی حالات کا جائزہ لینا چاہیئے ۔ یہ الفاظ ایک امریکی فوجی کے ہیں جس نے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا اور جاپان کو شکست دیکر واپسی کے سفر میں فتح یابی کی نشانی کے طور پر اوکھی ناوا کے جزیرے پر ہتھیار ڈالنے والی جاپانی فوج کے ایک سپاہی کی تلوار اپنے ساتھ لے آیا تھا۔اس شمشیر کو اپنے ساتھ امریکہ لانے کی ایک وجہ اور بھی تھی، اور وہ وجہ چند سطور پر مشتمل انگریزی زبان میں لکھا ہوا ایک پرتاثیر نوٹ تھا۔اس مختصر تحریر میں شکست خوردہ فوج کے سپاہی نے استدعا کی تھی کہ اس کی تلوار کو واپس اس کے اہل خانہ تک پہنچا دیا جائے، چونکہ یہ اس کے نزدیک خاندانی عزت اور حمیت کا معاملہ تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ کئی نسلوں سے یہ تلوار اس کے خاندان میں سفر کرتی چلی آرہی ہے۔ یہ آگاہی بھی اس نوٹ سے ملتی ہے کہ شائد جاپانی فوجی کو اپنی منتظر موت کا احساس تھا اور یہ معمولی سی فرمائش اس کی وصیت بھی تھی۔1945 میں جنگ کا خاتمہ ہوا اور امریکی فوجی دوبارہ کبھی جاپان نہ آسکا۔اس کے دل میں ایک کسک ضرور تھی کہ مذکورہ شمشیر اس کے اصل مالکان یعنی جاپانی فوجی کے ورثاء تک پہنچائی جانی چاہیئے ۔گرچہ اس نے کسی سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا جسے نبھانا ضروری ہو، مگر ایک سپاہی کے دوسرے سپاہی کے لئے احساسات تھے، چاہے وہ حریف کی طرف سے ہی میدان جنگ میں اترا تھا۔مرتے وقت اپنے پوتے کو اس ننانوے سال کی عمر پانے والے امریکی فوجی نے اپنی خواہش کا

اظہار کر دیا، جواں سال پوتا خوش قسمتی سے چونکہ صحافی ہے اور ذرائع ابلاغ سے منسلک دنیا بھر کے صحافیوں سے رابطے میں رہتا ہے۔ اس نے دادا کی خواہش اور مکمل واقعہ جاپان کے سب سے زیادہ شائع ہونے والے اخبار ''اساہی'' کے ایک نامہ نگار سے بیان کیا جو کہ اس کا دوست ہے۔ جاپانی رپورٹر نے شمشیر کے ساتھ منہاں متذکرہ خط پر درج پتے کی مدد سے میازا کی شہر کی انتظامیہ سے رابطہ کیا اور انگریزی زبان میں لکھے گئے اس مختصر مکتوب کی عبارت مقامی حکومت کے اہلکاروں کے ساتھ سانجھی کر دی، مختصر وقت میں شہری انتظامیہ نے جاپانی فوجی کے بیٹے کا مکمل کھوج لگا لیا۔ تمام معلومات کے تبادلے کے بعد امریکی فوجی کے صحافی پوتے اور جاپانی فوجی کے بیٹے کا آپس میں رابطہ کروا دیا گیا۔ دو جولائی کو لیون کراؤسٹ نامی امریکی سپاہی کا پوتا مذکورہ تلوار لے کر جاپان کے شہر میازا کی پہنچ گیا۔ جاپانی سپاہی کو اس دنیا سے گزرے تو عرصہ بیت گیا۔ اب تو اسکا بیٹا بھی 96 سال کا ہے۔ جس نے یہ تلوار اپنے گھر پر وصول کی اور مرحوم باپ کی باقیات وتصویر کے سامنے سجا دی۔ تھا کے میسے نامی جاپانی اور امریکی صحافی کی آج اخبار کے صفحہ دوم پر تصویر چھپی ہے۔ جس میں تلوار اور مرحوم سپاہی کی تصویر کا فریم نمایاں ہے۔ امریکی نوجوان کا کہنا تھا کہ اسے خوشی ہے کہ اصل حق داروں تک ان کا حق پہنچ گیا، جو کہ یقیناً جاپانی فوجی کے ورثا ہیں۔ اس بات پر بھی طمانیت محسوس کرتا ہوں کہ اپنے دادا مرحوم سے کیا وعدہ میں نے پورا کر دیا۔ وہ امریکی جریدے میں اس تلوار اور اس سے منسلک دو خاندانوں کی کہانی لکھنا چاہتا ہے۔ اس جزیرے کا دورہ کرنا بھی چاہتا ہے جہاں سے یہ شمشیر اس کے دادا کو ملی تھی۔

سرکاری اہل کاروں اور منصب داروں کو بیرونی دنیا سے ملنے والے تحائف کی اہمیت بھی میری نظر میں اس تلوار جیسی ہی ہوتی ہے۔ ایسے تحفے توشہ خانے میں جمع ہوتے ہیں۔ وزیراعظم نریندر مودی کے ایک تقریب سے خطاب کی ویڈیو میں اس کے منہ سے توشہ خانہ کا لفظ سن کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کی وجہ شائد ہزار سال تک برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ہے، جس کے دوران ہی یہ توشہ خانہ کا ادارہ قائم ہوا۔ اسی سبب سے نام بھی اب تک وہی چلا آ رہا ہے۔ نریندر مودی

جب گجرات کے وزیراعلیٰ تھے تواسی دور میں ملنے والے تحائف توشہ خانہ میں جمع کروادیتے۔بعدازاں ان کی نیلامی کروانا شروع کردی۔اس نیلامی سے حاصل شدہ رقم کووہ لڑکیوں کی تعلیم کی ترقی کے لئے کام کرنے والے ایک فلاحی ادارے کے اکاؤنٹ میں جمع کروادیتے۔اب تک ان کا یہ طرزعمل جاری ہے،جبکہ وہ وزیراعظم بن چکے ہیں۔توشہ خانہ میں جمع کرائے گئے تحائف کی نیلامی سے حاصل شدہ سرمایہ اگر جمع کیا جائے تواب تک یہ کل رقم اربوں میں بنتی ہے۔مستحسن عمل کرنے والا چاہے آپکا دشمن ہی کیوں نہ ہواسکی پیروی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے موجودہ قوانین کی روشنی میں تحفہ وصول کرنے والا کوئی سرکاری اہلکار،منصب دار اگر معمولی رقم ادا کرکے یہ تحائف خریدنا چاہتا ہے تو توشہ خانہ کے اصول وضوابط میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔چاہے ہمیں موجودہ قانون سے اختلاف ہی ہو پھر بھی کسی حدتک یہ بات قابل فہم ہے۔ذاتی یادگار اور خاندانی وقار کے لئے بعض لوگ ایسے تحفے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔چونکہ قانون میں اس امر پر پابندی نہیں ہے اس لئے کوئی بھی اعتراض کرنا نہیں بنتا،گرچہ یہ عمل بھی کوئی میری نظر میں قابل ستائش بات نہیں ہے۔مگران تحائف کو بازار میں فروخت کرنے پر پابندی ہونی چاہیے۔

چونکہ یہ تحائف کسی فرد کو نہیں دیے جاتے،بلکہ اس کے منصب کو دیے جاتے ہیں۔ایسے تحائف بازار میں بیچنا نہ صرف سرکاری مناصب اور ملک کی توہین ہے بلکہ تحفہ،ہدیہ پیش کرنے والے کی بھی توہین کرنے کے مترادف ہے۔پارلیمان کو چاہیئے کہ اس سلسلے میں ضروری قانون سازی کرے۔توشہ خانہ سے خریدے گئے تحائف بازار میں بیچنا قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔

سابق جاپانی وزیراعظم کا قتل

گزشتہ روز ایک انتخابی اجتماع سے سابق جاپانی وزیراعظم شنزو آبے خطاب کر رہے تھے کہ ایک مسلح شخص نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، پوری دنیا اور جاپان میں اس خبر کو صدمے اور حیرانی کے ساتھ سنا گیا۔ صدمے کی وجہ تو یہ ہے کہ شنزو آبے فقط ایک سیاستدان یا سب سے طویل عرصہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہنے کا اعزاز ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک مقبول رہنما اور جاپان کے موجودہ معاشی رجحان کے بانی تھے۔ ان کی معاشی پالیسیوں کو جداگانہ اور موثر طرز کی بنیاد پر جاپانی اکنامک پالیسی ''آبے نامکس'' یعنی شنزو آبے کی اکنامکس کہلاتی رہی ہے۔ ایسے عوامی رہنما اور قومی لیڈر کا دن دیہاڑے کیمروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان میں کھڑے قتل ہو جانا بلاشبہ صدمے کی بات ہے۔ بلکہ انتہائی دکھ اور افسوس کا مقام ہے۔

حیرانی کا پہلو یہ ہے کہ جاپان میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ گزشتہ سو سال کی تاریخ میں آبے سان وہ پہلے سابق و موجودہ وزرائے اعظم کی فہرست میں سے آدمی ہیں جنہیں قتل کیا گیا۔ امریکی صدر کینیڈی اگر قتل ہو جاتے ہیں تو یہ بات افسوس ناک ہے مگر حیران کن نہیں چونکہ ہر سال پینتیس ہزار امریکی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں، جبکہ اسی دوران جاپان میں گولی کا شکار ہلاک ہونے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ اسلحے پر یہاں شدید کنٹرول ہے۔ لائسنس ملنا ناممکنات کے قریب کی کوئی چیز ہے۔ یاد رہے کہ اس قتل کی واردات میں استعمال ہونے والا پستول ملزم نے گھر پر خود تیار کیا تھا۔ اس کی وجہ اس کا فوجی پس منظر بھی ہے۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق وہ نیوی

کا سابق اہلکار تھا۔ملزم کی عمر گرچہ 41 سال ہے مگر وہ عرصہ پہلے بحری فوج سے علیحدہ ہو چکا ہے۔فوج کا لفظ استعمال کرتے ہوئے میں جھجک رہا ہوں۔اس تامل اور جھجک کی وجہ یہ ہے کہ جاپان میں آئینی طور پر کوئی فوج نہیں ہے۔ملک کا آئین جو کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی ایٹمی بمباری کے نتیجے میں جاپان کی شکست کے بعد تحریر کیا گیا ہے،اس آئین کی رو سے جاپان SDF یعنی سیلف ڈیفنس فورس کے نام سے دفاعی سپاہ تو رکھ سکتا ہے مگر یہ سپاہ جاپان کی سرزمین سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔فوج کے متعلق ان تفصیلات کو تحریر کرنے کا ایک مقصد ہے، یہ بلا جواز گفتگو نہیں ہے۔سابق وزیراعظم کے قتل کے محرکات کا جائزہ لینے کے لئے ان تفصیلات سے آگاہی ضروری ہے۔چونکہ قاتل نے اپنے مجرمانہ فعل کا جو جواز بیان کیا ہے وہ محولہ بالا تفصیل سے جڑا ہوا ہے۔جب شنزو آبے وزیراعظم تھے تو انہوں نے آئین میں تبدیلی کی گئی شق کا باقاعدہ استعمال کیا کہ امدادی کاموں اور غیر مسلح کاروائیوں میں حصہ لینے کے لئے جاپانی فوج (SDF) کو بیرون ملک بھیجا جا سکتا ہے۔ان کے دور کے آغاز سے جاپانی فوج کمبوڈیا سے لیکر ویتنام اور منگولیا تک امدادی کاروائیوں اور تربیت دینے کے عمل میں حصہ لیتی آرہی ہے۔یاد رہے کہ شنزو آبے پہلی مرتبہ ایک سال کی مدت کے لئے 2006ء میں وزیراعظم بنے تھے اور پھر 2012ء سے کر 2020ء تک وہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر براجمان رہے۔2012ء سے ہی مختلف امدادی مشن ہیں جن میں حصہ لینے کے لئے جاپانی فوج غیر ملکی سرزمینوں پر غیر مسلح مگر فوجی نوعیت کے منصوبوں کا حصہ ہے۔یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے کہ بیرون ملک فوج بھیجنے پر پابندی کی منسوخی کا قانون 1992ء میں ہی منظور ہو چکا تھا،جس کی وجہ خلیجی جنگ میں جاپان کی عدم شرکت تھی،اس کے عوض چیک بک پالیسی اپناتے ہوئے جاپان نے تیرہ ارب امریکی ڈالر ادا کئے تھے۔دنیا بھر میں جب اس طرز عمل پر تنقید کی گئی تو پھر جاپان کی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کیا کہ وہ انسانی بہبود اور امدادی کاروائیوں کے علاوہ عسکری تربیت تو بیرون ملک محاذوں پر فراہم کرے گا مگر کسی مسلح تصادم اور کاروائی میں حصہ نہیں لے گا۔یہی قانون اب تک رائج ہے۔

ٹوکیو شہر کے مرکز شنجیکو میں 1954 میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے شنزو آبے تاریخی

شہر نارا میں جب قتل ہوئے تو وہ وہی کام کر رہے تھے جو ساری زندگی کرتے آئے تھے۔یعنی عوامی رابطہ ،لوگوں کے ساتھ مکالمہ،اپنی جماعت کے ایک کارکن کے لئے انتخابی مہم سے خطاب۔اپنی جماعت لبرل ڈیموکریٹک پارٹی کی حمایت کے لئے کوشش۔برسبیل تذکرہ جاپان میں دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً تمام عرصہ اسی سیاسی جماعت کی حکومت رہی،ماسوائے چند سال ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کے مختصر دورانیے۔

مرحوم وزیراعظم روایتی پڑھائی میں زیادہ اچھے نہیں تھے۔بی اے کرنے کے بعد امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے گئے مگر یونیورسٹی سے خارج کر دیئے گئے اور تعلیم مکمل کئے بغیر ہی جاپان واپس آ گئے۔1993 میں پہلی مرتبہ وہ پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے۔سیاست کا میدان ان کے لئے نیا نہیں تھا،چونکہ ان کے دادا بھی وزیراعظم رہ چکے تھے۔2005 میں پہلی مرتبہ وزیر بنے اور اگلے ہی برس وزیراعظم منتخب ہو گئے۔بیماری کے سبب مگر ایک سال بعد ہی وہ مستعفی ہو گئے ،سالہا سال اپنی سیاسی جماعت کے سربراہ کے طور پر کام کیا اور اپوزیشن لیڈر بھی رہے۔یہ دلچسپ بات ہے کہ طویل ترین عرصہ وزیراعظم رہنے والے شنزو آبے نے دو مرتبہ اپنے منصب سے استعفیٰ دیا اور دونوں مرتبہ وجہ ان کی خراب صحت رہی۔ورنہ عوام میں وہ ہمیشہ مقبول ہی رہے۔

ان کے قتل کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مبینہ قاتل ان کی دفاعی پالیسی کا شدید مخالف تھا۔دروغ بر گردن راوی،کہا جاتا ہے کہ شنزو آبے ایک ایسی قوم پرست نیم خفیہ تنظیم کے رکن تھے جو جاپان میں بادشاہت کی بحالی چاہتی ہے اور یہ دائیں بازو کی تنظیم جاپانی فوج کا روایتی ،تاریخی کردار بحال کر کے اسے ایک لڑاکا فوج میں تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا جدید اسلحہ حاصل کرنے کی حامی ہے۔شائد یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران 2015 میں پہلی مرتبہ جاپانی فوج کی مشترکہ جنگی مشقوں کا اہتمام کیا۔چین کی پیش قدمی روکنے کے لئے QUAD نامی فوجی اتحاد کا نا صرف خیال پیش کیا بلکہ امریکہ،آسٹریلیا اور انڈیا کے ساتھ مل کر اس

تنظیم کو عملی شکل دے ڈالی۔ عالمی تزویراتی منظر نامہ آج اس تنظیم کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

شنزو آبے کے مبینہ قاتل کی چند ویڈیوز سامنے آئی ہیں جن میں وہ دائیں بازو کی اس مذکورہ تنظیم ''نیپون کھائی گی'' کے تمام ارکان کو قتل کر دینے کے عزم اور خواہش کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے۔ شنزو آبے کا شمار اس قوم پرست تنظیم کے اہم ترین ارکان میں ہوتا تھا۔ اس تنظیم کا ماننا ہے کہ جاپان کو معذرت خواہانہ رویہ ترک کر کے تاریخ میں مثبت کردار کو ابھارنا چاہئیے، وہ قوانین جو جاپان کو ایٹمی اسلحہ اور بیلسٹک میزائل بنانے سے روکتے ہیں، ایسے قوانین کا خاتمہ کر دینا چاہئیے۔ نیز کسی ملک پر حملہ آور نہ ہونے کے عزم کے قانون کو تبدیل کر دینا چاہئیے چونکہ بعض اوقات جارحیت ہی بہترین جنگی حکمت عملی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے بہت سارے قارئین کو امن کے منافی یہ باتیں پسند نہ ہوں، یہ ایک رائے ہے جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ نقطہ نظر کے فرق کو کسی بے گناہ اور مقبول عوامی رہنما کے قتل کا جواز بنا کر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مبینہ قاتل جسے موقع واردات پر ہی گرفتار کر لیا گیا ہے، ذہنی طور پر بیمار شخص ہے۔ قتل کی تحقیقات تو یقیناً اچھے انداز میں انصاف اور شفافیت پر مبنی ہوں گی مگر شنزو آبے تو بہر حال واپس نہیں آئے گا۔ جاپان کی جمود کا شکار معیشت کو بھرپور توانائی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے اور کم از کم معیار زندگی کو بہتر کرنے والے وزیر اعظم کے طور پر انہیں ہمیشہ خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔

ٹوکیواولمپک 2020

ایک سال کی تاخیراور بے شمار خدشات وخطرات کے باوجودٹوکیواولمپک 2020بالآخرشروع ہوچکے ہیں۔چندکھلاڑیوں میں کرونا کی تشخیص بھی ہوئی ہے مگرغیرمعمولی احتیاطی تدابیراورطبی اقدامات کے باعث یہ امکان بہت ہی کم ہے کہ اولمپک کے دوران کوئی بڑاوبائی وقوعہ پیش آئے۔دنیا بھرسے آئے ہوئے اٹھارہ ہزارکھلاڑیوں میں سے چندایک میں Covid-19 کی تشخیص کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے،ایسے حالات میں کہ اس نامرادموذی مرض نے ابھی ہماری دنیا کا پیچھانہیں چھوڑا ہے۔اسی سبب سے یہ اولمپک مقابلے شائقین اور تماشایوں کے سٹیڈیم میں داخلے کے بغیرہی وقوع پذیرہورہے ہیں۔ملک بھرکے تمام ٹی وی چینل ہمہ وقت اولمپک مقابلے دکھاکرسٹیڈیم میں داخلے کی پابندی کاازالہ کرنے کی کامیاب کوشش کررہے ہیں۔پینتیس کھیلوں کے چارسومقابلے جن میں پہلی دوسری اورتیسری پوزیشن لینے والے کھلاڑیوں کوبالترتیب سونے،چاندی اورکانسی کے تمغے پہنائے جارہے ہیں۔افتتاحی تقریب بہت بھرپورتھی۔مگرتماشایوں کے بغیراسٹیدیم سونا سونا سا لگ رہا تھا۔اسٹیدیم کے گردونواح کے لوگوں نے مگرآتش بازی اورڈرون طیاروں کی روشنیوں کے کرتبوں سےضرورلطف اٹھایاہوگا۔

اس سے پہلے جاپان میں 1964 میں اولمپک مقابلےمنعقدہوئے تھے۔دلچسپ بات یہ کہ ٹوکیواولمپک 2020 کا ترانہ وہی ہے۔جوستاون سال پہلے ہونے والے اولمپک مقابلوں کے موقع پرپچھلی مرتبہ تشکیل دیا گیا تھا۔اتنی تبدیلی ضرورکی گئی ہے کہ ترانے کی دھن دوبارہ ترتیب دے کراسے

جدید دور سے ہم آہنگ بنایا گیا ہے۔ نغمے کی سرکاری ویڈیو میں تازہ مناظر عصرِ حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پیش کئے گئے ہیں۔ٹوکیو اولمپک 2020 کا عنوان پڑھ کر آپ کو شائد کچھ عجیب محسوس ہو کہ اب تو 2021 سال بھی اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ 2020 کہاں سے آن ٹپکا؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ کھیلوں کے مقابلے کا نام تو طے شدہ تھا۔ مقررہ وقت تو گزشتہ برس تھا مگر کرونا نامی منحوس مرض نے آن دبوچا، جو اپنے پنجوں سے دنیا کو ابھی تک رہائی دینے پر آمادہ نہیں، نئے نئے بھیس بدل کر پہلے سے خطرناک بن کر حملہ آور ہو رہا ہے اور ابھی تک ہماری جان چھوڑنے پر راضی نہیں ہے۔ جاپانیوں نے تو وقت سے پہلے یعنی پچھلے سال ہی اولمپک گاؤں کی تیاری بھی مکمل کر لی تھی۔ اس گاؤں کی ایک چیز نے مجھے خاص طور پر اپنی جانب متوجہ کیا، اتھلیٹ جس بیڈ پر سوتے ہیں، وہ گتے سے بنائے گئے ہیں۔ شائد اس کا مقصد جاپان کو ماحول دوست ملک کے طور پر اقوام عالم کے سامنے پیش کرنا ہے۔

بہت برسوں سے اب یہ روایت ہے کہ موسم گرما میں ہر چار سال بعد جب اولمپک مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے، تو ان کے ساتھ ہی خصوصی افراد کے لئے بھی اولمپک مقابلوں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔ گرما اولمپک کی عالمی کامیابی کے بعد سرما اولمپک بھی ہر چار سال بعد باقاعدگی سے منعقد ہو رہے ہیں۔ کھیلوں کے ان مقابلوں کی ترتیب یوں رکھی گئی ہے کہ گرما اور سرما کے اولمپک میں دو سال کا فرق اور وقفہ ضرور رکھا جاتا ہے۔ صدیوں پہلے اولمپک مقابلوں کی ابتداء یونان سے ہوئی تھی۔ آغاز کے دنوں میں ان کھیلوں کی اہمیت مذہبی تھی۔ یہ کھیل یونانی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے پیش کئے جاتے تھے۔ قدیم اولمپک مقابلوں کا آغاز دیوتا زیوس کی درگاہ سے اولمپیا شہر میں ہوا تھا۔

اساطیر کے مطابق دیوتا ہرکولیس نے ان مقابلوں کا نام اولمپیا شہر کی نسبت سے اولمپک رکھا اور ہر چار سال بعد باقاعدگی سے کرانے کی رسم ڈالی۔ یہ بھی روایت ہے کہ دیوتا ہومر کی پیدائش کی خوشی میں ان مقابلوں کی ابتداء ہوئی تھی۔ پہلا اولمپک اسٹیڈیم بھی دیوتا ہرکولیس نے بنوایا تھا۔ اگرچہ قدیم اولمپک مقابلے زمانہ قبل از مسیح میں صدیوں تک باقاعدگی سے یونان کے شہر اولمپیا میں منعقد

ہوتے رہے،مگر جدید اولمپک مقابلے کئی صدیوں کے وقفے کے بعد 1896 میں دوبارہ شروع ہوئے۔نئے اولمپک کھیلوں کی ابتداء کا سہرا ایک فرانسیسی شخص کے سر سجتا ہے۔اسی شخصیت نے 1894 میں اولمپک کمیٹی تشکیل دی تھی۔

ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ یہ اولمپک کے پرچم کا بھی صد سالہ جشن ہے۔اگرچہ یہ جھنڈا 1916 میں تشکیل پایا تھا۔مگر 1920 کے کھیلوں کے مقابلوں میں پہلی مرتبہ اسے لہرایا گیا تھا۔اس پرچم میں پانچ دائرے پانچ آباد براعظموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔یاد رہے کہ شمالی وجنوبی امریکہ کو ایک ہی براعظم قرار دیا گیا ہے۔اولمپک پرچم کے رنگ ایسے ہیں کہ دنیا کے تمام پرچموں کا کوئی نہ کوئی رنگ اس کے رنگین دائروں سے ضرور ملتا ہے۔یا پھر سفید بیک گراؤنڈ جو کہ امن عالم کی خواہش کا مظہر اور اسے پاکیزگی کا علم بناتا ہے۔

اگرچہ شائقین کے بغیر کھیلوں کے مقابلے پھیکے پھیکے اور بجھے بجھے سے محسوس ہو رہے ہیں،البتہ ٹوکیو میں قائم اولمپک میوزیم میں داخلے کی عام اجازت ہے۔یہاں اولمپک کھیلوں کی مکمل تاریخ سے آگاہی ملتی ہے۔اور اس بابت اہم معلومات دستیاب ہیں۔اولمپک کھیلوں میں شریک اٹھارہ ہزار کھلاڑیوں کی رہائش اور قیام کی مکمل سہولیات پر مبنی اولمپک گاؤں شہر سے باہر بسایا گیا ہے۔ویسے تو ٹوکیو کنکریٹ اور اسفالٹ کا جنگل ہے۔جہاں زمین کا ٹکڑا مشکل سے نظر آتا ہے۔اولمپک ویلج کے لئے تعمیر کی گئی کثیر المنزلہ رہائشی عمارتیں ان مقابلوں کے بعد بطور رہائشی اپارٹمنٹ عام لوگوں کو فروخت کر دی جائیں گی۔ان کی فروخت کے سلسلے میں ایڈوانس بکنگ شروع بھی ہو چکی ہے۔عالمی وبا کے دوران جب خوف اور وحشت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے،یہ کھیلوں کے مقابلے تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو رہے ہیں۔جاپان کی فضا میں امید کی مہک محسوس کی جا سکتی ہے۔

عوامی سواری

سائیکل سواروں کی جانب سے ٹریفک قوانین کی بڑھتی ہوئی خلاف ورزیوں اور اس پر پائی جانے والی تشویش کے پیش نظر، خطرناک سائیکل سواروں پر پولیس کا کریک ڈاؤن کرنے کا اصولی فیصلہ سامنے آیا ہے۔ یہ ہے جاپان کے سب سے بڑے اخبار کی صفحہ دوم پر سب سے بڑی سرخی، جس نے اوپر کا آدھا صفحہ گھیر رکھا ہے۔ تفصیلات پر مٹی ڈالیے۔ یہ خبر بذات خود آپ کو حیران کر دینے کے لئے کافی ہوگی، مزید برآں، سماج کی بنت اور ہیئت کے بارے میں اس خبر سے بہت ساری باتیں ذہن میں صاف ہو جاتی ہیں۔ اس مجوزہ پولیس آپریشن کی اگر وجوہات میں جائیں، تو سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹوکیو شہر میں گزشتہ ایک برس کے دوران پیش آنے والے ٹریفک حادثات میں سے تقریباً آدھے یعنی 47 فیصد ایسے ہیں، جن میں بائیسکل ملوث پائی گئی ہے۔

سائیکل سواروں کی بڑھتی ہوئی قانون شکنیوں سے تنگ آتی ہوئی میٹروپولیٹن پولیس نے سزائیں سخت کرنے کا اصولی فیصلہ کر لیا ہے۔ ٹریفک کے اصولوں کی پاسداری نہ کرنے والوں کی سزاؤں میں سختی کے چار پہلو نمایاں بیان کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ ٹریفک سگنل کی سرخ بتی کا لحاظ نہ کرنے والے کو اب وارننگ کی بجائے جرمانے کی پرچی تھما دی جائے گی۔ پولیس نے حتمی اور دوٹوک فیصلہ کر لیا ہے کہ بس اب تنبیہ نہیں جرمانے ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سائیکل سوار اس ریاست اور اس کی پولیس کے لاڈلے ہیں، ایسے اصولی اور دوٹوک فیصلے بارہا سنے جا چکے ہیں، مگر آخر میں ڈھاک کے تین پات والی بات ہے۔ شاید لوگوں کو ذرا ڈرا، دھمکا کر، ٹریفک قوانین کی

زیادہ پاسداری کرنے پر آمادہ کرنا مقصود و مطلوب ہے۔حکومت کی دلی تمنا اور اولین خواہش ہمیشہ سے ہی یہی رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سائیکل سواری اپنائیں۔شاید یہ حکومتی اقدامات اور سماجی حالات ہی ہوں جن کی وجہ سے اس برس 22 فیصد سائیکل سواروں میں اضافہ ہوا ہے۔ان میں سے اکثریت بیس اور تیس سال کی عمر کے درمیان افراد کی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سائیکل سواروں کی بڑھتی ہوئی تعداد محنت کش اور سفید پوش طبقے تک محدود ہے۔سابق وزیر قانون جو آج کل بھی جاپانی پارلیمان کے معزز رکن ہیں،گزشتہ روز جب وہ اپنی سائیکل چلاتے ہوئے پارلیمنٹ کی عمارت میں اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لا رہے تھے،تو وہاں ایک کثیر الاشاعت اخبار کے صحافی نے ان سے ان کی سواری کے بارے میں استفسار کیا۔سوال و جواب کا انداز بڑا دلچسپ تھا۔صحافی نے پوچھا،جناب عالی مقام! آپ نے یہ سائیکل کب خریدی ہے؟ سابق وزیر قانون کا جواب تھا کہ جب مجھ سے وزارتی سیاہ رنگ کی کار واپس لے لی گئی تو اس کے فوراً بعد ہی میں نے یہ سیاہ رنگ کی سائیکل خرید لی تھی۔یہ میری متبادل ٹرانسپورٹ بڑی ہی اچھی چلتی ہے۔واضح رہے کہ یہاں متبادل ٹرانسپورٹ سے مراد کالی گاڑی کی جگہ کالی سائیکل ہے۔

پوری دنیا میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں،اور ان میں آئے دن ہوشربا اضافے کے تسلسل نے تمام عالم کے لوگوں کی زندگی اور انداز زیست کو متاثر کیا ہے۔سائیکل سواری کی مقبولیت میں اضافے کی ایک اور وجہ کرونا وائرس بنا ہے،جس نے پبلک ٹرانسپورٹ کو خطرناک بنا دیا ہے۔ایسے میں سائیکل ایک بہتر اور سستے متبادل کے طور پر اپنایا جا رہا ہے۔عوامی ذرائع آمدورفت یعنی ٹرین،بس،ٹیکسی وغیرہ کی نسبت سائیکل اور ذاتی انفرادی سواری میں کرونا وائرس سے متاثر ہونے کا امکان یقیناً کافی کم ہوتا ہے۔ایک اور پہلو گھروں پر کھانے کی ڈلیوری سروس میں اضافہ ہے،جس کے لئے سائیکل سب سے زیادہ استعمال ہو رہا ہے۔کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے پیش نظر لوگوں نے ریستورانوں میں جا کر کھانا کھانا کم کر دیا ہے۔گھروں پر کھانے کی ڈلیوری جتنی اب مقبول ہے،وبا کے

پھیلاؤ سے پہلے اس کا بیس فیصد بھی یقیناً نہیں تھی۔

بات سائیکل سواروں کے متعلق ہورہی ہے تو یہ تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ آج کل الیکٹرک سائیکل بھی بے حد مقبول ہورہے ہیں۔جس طرح ہائبرڈ اور الیکٹرک کاریں بجلی اور پٹرول دونوں کی مدد سے چلتی ہیں،اسی طرح ہائبرڈ الیکٹرک بائیسکل میں پیڈل بھی لگے ہوئے ہیں اور بجلی سے چارج بھی ہوتا ہے۔سفر کے آغاز میں چند پیڈل گمانے کے بعد یہ ایک طرح سے موٹر سائیکل ہی بن جاتا ہے،مگر اس کی حد رفتار زیادہ نہیں ہوتی ہے۔یعنی موٹر بائیک والی نہیں بلکہ سائیکل کی اوسط رفتار سے ہی یہ سفر طے کرتا ہے۔ایسے ہی ہائبرڈ الیکٹرک سائیکل بنانے والی ایک کمپنی پیناسونک ہے۔جی ہاں!وہی شہرہ آفاق الیکٹرونکس بنانے والی کمپنی جس کا تعلق اوساکا شہر جاپان سے ہے۔خبر یہ ہے کہ پیناسونک کمپنی سائیکل کے ٹریفک حادثات میں کمی لانے کی کوششوں میں پولیس اور حکومت کا ہاتھ بٹارہی ہے۔اس سلسلے میں وہ تمام ملک میں عوامی آگاہی کے نقطۂ نظر سے سیمینار منعقد کررہی ہے۔لوگوں میں ٹریفک قوانین سے متعلق آگاہی اور ان کے احترام کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے مستقبل میں زیادہ سرعت سے پیناسونک ایسے آگاہی سیمینار منعقد کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔یہاں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ اس برس ٹوکیو اور اس کے گردونواح میں دس لاکھ سے زائد الیکٹرک سائیکل فروخت ہوئے ہیں۔اندازہ لگائیں کہ یہ ایک ملین کی تعداد فقط ایک شہر ٹوکیو میں بکنے والے الیکٹرک سائیکلوں کی ایک سال دورانیے کی ہے۔روایتی عمومی سائیکل یقیناً کئی گنا زیادہ بکتا ہے،پرانے اور ری کنڈیشنڈ سائیکلوں کی خرید وفروخت ان اعداد وشمار کے علاوہ ہے۔اس سے آپ کو یقینی طور پر اندازہ ہوگیا ہوگا کہ جاپانیوں میں سائیکل سواری کتنی مقبول ہے اور اس سماج میں یہ کتنی اہمیت کی حامل ہے۔

رزق ضائع مت کریں

یہاں بچپن سے ہی سکول اور گھروں میں نونہالوں کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ کھانے کے کٹورے میں چاول کا ایک دانہ بھی باقی نہیں بچنا چاہیئے۔اگر کم بھوک ہے تو پھر پلیٹ میں کم مقدار میں کھانا ڈالیں۔مگر جو کھانا ڈال لیا ہے وہ مکمل طور پر ختم کرنا چاہیے۔جاپان کے کسی بھی ریستوران میں اگر آپ جائیں تو حیران ہوں گے کہ کوئی بھی گاہک کھانا برتن میں چھوڑ کر نہیں جاتا۔جھوٹھا کھانا گھر میں چھوڑنے کا تو تصور بھی محال ہے۔جاپانی چاول خور قوم ہے اور مچھلی اس کے ساتھ ان کی مرغوب غذا ہے۔آج کل جس طرح ہر چیز ڈیجیٹل ہوتی جارہی ہے،تو اس کے اثرات کھانے، پینے کے مقامات پر بھی نظر آنے لگے ہیں۔فیملی ریستوران بھی اب روایتی انداز چھوڑ کر جدید ٹیکنالوجی اپناتے جارہے ہیں۔جس ریستوران میں اکثر میں کھانا کھاتا ہوں اور یہاں کی مقبول عام جگہ ہے،یعنی ہر خاص وعام کے طعام کا اہتمام مناسب نرخوں پر معیاری انداز کا نعرہ اس کا دعویٰ ہے۔یہاں اب کوئی ویٹر آپ سے آرڈر لینے نہیں آتا ہے۔یہ معاملہ ایک شہر یا پھر چند فیملی ریستوران کی شاخوں کا نہیں ہے، بلکہ آہستہ آہستہ بیرے ریستوران سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ان کی جگہ سلیٹ نما اسکرین رکھی ہوئی ملتی ہے،آپ اپنی پسند کا کھانا منتخب کرتے جائیں،اسی اسکرین پر آرڈر دے دیں۔

چند لمحوں بعد ایک روبوٹ نما گاڑی ،تھوڑے بہت ماڈل کے فرق کے ساتھ،آپ کا کھانا پکڑے،آپ کی نشست پر پہنچ جائے گی۔آپ کے آرڈر کئے ہوئے کھانے کے ساتھ ہی اس

کابل بھی یہی روبوٹ لیتا آئے گا۔کھانا اٹھایئے اور روبوٹ کو چلتا کیجئے۔دلچسپ پہلو آج کھانا آڈر کرتے ہوئے مجھے یہ نظر آیا کہ اگر عمومی سائز کی چاول کی پلیٹ سے آپ نے چاول کم کروانے ہیں تو اس کے لئے آپ کو پچاس روپے اضافی دینا ہوں گے۔جبکہ اگر عمومی مقدار سے زیادہ چاول کھانا چاہتے ہیں تو وہ مفت میں ہی مقدار بڑھا دیں گے۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ پچاس روپے اضافی دینے کی بجائے گاہک کو جتنی بھوک ہے،تناول کرکے باقی پلیٹ میں ہی چھوڑ کر چلا جائے؟مگر ایسا ہوتا نہیں ہے،جاپانی کو اگر کم بھوک ہے یا پھر وہ ڈائیٹنگ کر رہا ہے تو پچاس روپے زیادہ دے کر پلیٹ میں چاول کی مقدار کم کروائے گا،مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کھانا جوٹھا چھوڑ کر چلا جائے۔یہ بچپن کی تربیت کا اثر ہے جو رزق کا ضیاع اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے۔یہ بات ثقافت کا حصہ بن چکی ہے کہ کھانا ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ایک دانہ بھی اناج کا کسی تھالی میں بچا نہیں دکھتا ہے،کہ یہ بات خلاف تہذیب ہے۔

رسول اکرمؐ کے متعلق یہ روایت سنی ہے کہ ان کے کھانے کا برتن با آسانی پہچانا جاتا تھا۔جس برتن میں وہ کھانا کھاتے وہ ہمیشہ بالکل صاف ہوتا تھا۔کبھی اس میں بچا ہوا کھانا نہیں ہوتا تھا۔جاپانیوں اور ہم پاکستانیوں میں ایک قدر اور مشترک ہے کہ روایتی طور پر یہ بھی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں،ہماری طرح آلتی پالتی مار کر۔دیارِ مغرب سے آنے والے اس نشست و برخاست سے اکثر کافی تنگ نظر آتے ہیں۔جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ چوکڑی مار کر بیٹھنا بھی ایک فن ہے۔کھانے پینے کے معاملے میں یہاں چور بازاری نہیں ہے۔کسی گلی کی نکڑ،کوئی گاؤں،گوٹھ میں کھلا ریستوران اور فائیو سٹار ہوٹل کے ریستوران میں لنچ کا خرچہ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔اگر سستا لنچ ہزار کا ہے تو اچھے ہوٹل میں واقع ریستوران کا لنچ دو ہزار کا ہوگا۔اس سے زیادہ فرق نہیں ہے۔اس بابت کبھی کبھی تو مجھے جاپان پر اشتراکی معاشرہ ہونے کا گمان گزرتا ہے کہ وزیراعظم کے لنچ بکس میں اور ایک مزدور کے ٹفن میں ایک پاکستانی کی نظر سے تو کچھ بھی مختلف نظر نہیں آتا۔امیر ترین افراد کے لنچ کی قیمت اور اجزائے خوردنی ایک محنت کش کے دوپہر کے کھانے

کے خرچے اور معیار کا موازنہ کریں تو یہ تقریباً برابر ہے۔

دوپہر کا کھانا عمومی طور پر لوگ گھروں سے ٹفن میں لے کر آتے ہیں۔چھوٹے بچوں کو اسکول کی طرف سے کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔جو کہ تقریباً مفت ہوتا ہے۔اگر آپ مسلمان ہیں یا کسی اور مذہب کے پیروکار ہیں،آپ اپنے بچے کو حلال ،کوشر،شاکاہاری یا کوئی اور مخصوص غذا کھلانا چاہتے ہیں تو اس کا اہتمام بھی سکول کی انتظامیہ خود کرتی ہے۔والدین کو کسی حال میں بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ گھر سے کھانا بھجوا سکیں۔دوپہر بارہ بجے سے ایک بجے تک کھانے کے اوقات شمار کئے جاتے ہیں۔کسی طرح کی قانونی قدغن اور بندش تو نہیں ہے،مگر اس دوران لوگ کسی کو نہ ملنے جاتے ہیں اور نہ ہی ٹیلی فون کرتے ہیں۔تمام دفاتر کھلے رہتے ہیں مگر اسٹاف باری باری بارہ سے ایک بجے دن کے دوران دوپہر کا کھانا کھالیتا ہے۔

میری دانست میں جاپان کی یہ کوئی بہت بڑی خوبی نہیں ہے کہ یہاں بلند و بالا عمارتیں ہیں،ان اونچی اونچی عمارتوں میں بڑے بڑے ہوٹل اور ریستوران ہیں۔شاپنگ مال اور خریداری کے مراکز ہیں۔کھانے پینے کی ایک سے بڑھ کر ایک جگہیں ہیں جن کی چکاچوند سے آنکھیں چندھیا جائیں،اس ملک کی اصل خوبی یہ ہے کہ ان بلند و بالا عمارتوں اور چکاچوند سے بھرپور گردوپیش کی ہر چیز عام آدمی کی پہنچ،دسترس اور قوت خرید میں ہے۔اس تحریر کا مقصد جاپانیوں کی مدح سرائی نہیں ہے،فقط اس جانب توجہ دلانی مقصود ہے کہ ہم رزق ضائع کرنے کی عادت اپناتے جا رہے ہیں۔حالانکہ روایتی اور ثقافتی اعتبار سے ہم کھانے کا بے حد احترام کرتے چلے آئے ہیں،مگر یہ بدعت اب بہت عام ہوتی جا رہی ہے۔ضیاع تو کسی بھی چیز کا برا ہے لیکن کھانا ضائع کرنا تو انتہائی بری بات ہے۔اس سے اجتناب برتنا چاہیئے۔رزق کا احترام کرنا قدامت پسندی نہیں شعور اور تہذیب کا لازمی تقاضا ہے۔

ایٹمی بمباری کی یادیں اور خطرات

اگست کا مہینہ جاپان میں مرنے والوں کو یاد کرنے کے لئے مخصوص ہے۔جس طرح ہم لوگ محرم الحرام میں روایتی طور پر اپنے پیاروں کی قبروں کی صفائی ستھرائی اور لیپا لپائی کے لئے جاتے ہیں، یہاں یہ رواج ہے کہ ماہِ اگست میں ہر شخص اپنے آبائی علاقے میں واپس جاتا ہے اور اپنے عزیز واقارب کی قبروں پر حاضری کے علاوہ ان کی دیکھ بھال اور مرمت کا کام بھی کرتا ہے۔جاپانی قبرستان پتھروں سے تراشیدہ قبور پر مشتمل ہوتا ہے۔کنکریٹ کے فرش پر قدِ آدم اونچائی اور ایک مربع میٹر رقبے میں قبر کا پتھر سے تراشیدہ تعویز ہوتا ہے۔قبر کو سمادھی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ مردے کو جلانے کے بعد اس کی استھیاں اور باقیات ایک چھوٹے سے مٹکے میں بند کر کے اس قبر میں رکھی جاتی ہیں۔اس سمادھی کی اوسط قیمت پاکستانی روپے میں تیس لاکھ کے قریب ہوتی ہے، مہنگی اقسام کی قبریں تو کروڑوں میں بنتی ہیں۔یہاں مگر ہر خاندان کی ایک ہی سمادھی ہوتی ہے، اس میں ہر مرنے والے کا مٹکا رکھ دیا جاتا ہے۔سکول کے بچوں کو پورا مہینہ چھٹی ہوتی ہے۔

دفاتر میں کیلنڈر کی تو کوئی چھٹی نہیں ہوتی، لیکن ہر ادارہ اپنی سہولت کے مطابق چار، چھ دن یا پھر ہفتے بھر کی چھٹیاں مناتا ہے۔ان چھٹیوں کا مقصد ملازمین کو اپنے آبائی علاقوں میں جانے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔روایتی لباس میں ملبوس طبل وعلم بردار نوجوان جلوس نکالتے ہیں، ہر بستی بستی نگر نگر نکلنے والے ان جلوسوں کا رنگ تعزیے کی بجائے عرس کا ہوتا ہے۔اس تفاوت کی وجہ موت اور حیات کا مذہبی تصور ہے۔اس برس کرونا وبا Covid-19 کے سبب روایتی گہما گہمی اور جوش وخروش سماجی

فاصلوں کے احتیاطی اصولوں کی نذر ہو گیا ہے۔اگست کے مہینے میں ''اوبون'' نامی اس تہوار کو منانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں امریکہ نے اسی مہینے کے دوران ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بمباری کی تھی۔جس سے لاکھوں کی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی تھیں۔امریکی ایٹم بموں کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی کے لوگوں نے جس آفت کا سامنا کیا،اس کے لئے المیے کا لفظ بہت چھوٹا لگتا ہے۔چشم زدن میں لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔آگ کے شعلوں اور تابکار شعاعوں سے زندہ بچ جانے والوں میں لاکھوں انسان ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔ایٹم بم کے نتیجے میں آنے والی ہولناک تباہی ایک ہی دن کی بپتا نہیں تھی۔برسوں بعد پیدا ہونے والے کئی بچے ایٹمی تابکاری اثرات کی وجہ سے معذور پیدا ہوتے رہے۔اس مرگِ انبوہ کا مشاہدہ کرنے والے بہت سارے لوگوں نے وحشت کی وجہ سے کئی دہائیوں تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا،پیہم خاموش رہے۔خوف،دہشت اور کرب کے اثرات زندہ بچ جانے والوں میں 75(پچھتر) سال بعد،آج بھی دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

جاپانیوں نے ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہنستے،بستے شہروں کو جل کر راکھ ہوتے دیکھا۔ایسی تباہی کہ جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں ملتی،نہ ہی اس کے بعد کسی انسانی بستی نے ایسی بربادی کا سامنا کیا۔اس قوم نے مگر ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر بیٹھ کر گریہ و ماتم پر ہی اکتفا نہیں کیا،نئے جذبے سے سرشار ہو کر تعمیرِ نو کی ایسی بھرپور مہم شروع کی کہ آج تک جاری محسوس ہوتی ہے۔ایسا بھی نہیں ہوا کہ جاپانیوں نے ماضی کو یکسر فراموش کر دیا۔روایت پسندی اور جدیدیت کا ایسا خوبصورت امتزاج شاید ہی دنیا کے کسی اور معاشرے میں نظر آئے جیسا جاپان میں ملتا ہے۔اچھی بات یہ ہے کہ یہ دونوں رنگ مکمل مفاہمت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت موجود ایٹمی ہتھیاروں کی کل تعداد کا صحیح تخمینہ لگانا تو کافی مشکل ہے،مگر دس ہزار جوہری ہتھیار ماہرین کے نزدیک ہائی الرٹ پوزیشن میں ہیں،جو کسی بھی وقت فائر کئے جاسکتے ہیں۔جوہری ہتھیاروں کے مجموعی عالمی ذخائر کا 93 فیصد حصّہ امریکہ اور روس کے پاس ہے۔بین الاقوامی ذرائع ابلاغ

میں شائع شدہ ماہرین کی رائے کے مطابق پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد کا اندازہ 120 اور 140 کے درمیان ہے، جبکہ ہندوستان کے پاس 110 کے آس پاس جوہری ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود ہے۔ عالمی ماہرین کی رائے ہے کہ پاکستان کے ایٹمی ذخائر ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ چین کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودہ تعداد کا اندازہ 250 کے قریب ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ چین کے ایٹمی اسلحے کے ذخائر پاکستان اور بھارت کے مجموعی ذخائر کے برابر ہیں۔

ان دنوں چین اور ہندوستان کے درمیان بڑھتی ہوئی سرحدی کشیدگی کی وجہ سے عالمی سطح پر بہت تشویش پائی جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں متحارب ممالک ایٹمی قوت رکھتے ہیں۔ جنگ کی صورت میں تزویراتی ماہرین کا خیال ہے کہ پاکستان کا غیر جانبدار رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ جنگ کی صورت میں دنیا کی کل آبادی کا چالیس (40) فیصد حصّہ جو ان تین ممالک میں آباد ہے براہِ راست ایٹمی بمباری کی لپیٹ میں آجائے گا، جو کہ یقیناً ایک خوفناک منظر نامہ ہے۔ ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگاساکی شہر کے مکین جس اذیت اور کرب سے گزرے خدا کرے ایسی تباہی دنیا کی کسی اور بستی کو کے مکینوں کو نہ دیکھنی پڑے۔

اک نگری دور افتادہ۔۔ پیکا

خدا کی قسم اس چھری کو آج تک خنزیر سے چھوا تک نہیں ہے۔ یہ خصوصی طور بکرے کاٹنے کے لئے ہے، فرط جذبات سے بڑھیا کے انگاروں کی طرح دہکتے سرخ گال اور سکڑتے ہوئے ہونٹ مجھے اب بھی اچھی طرح سے یاد ہیں۔ قدرے زنگ آلود، آٹھ انچ لمبی چھری اس نے جس انداز میں لہراتے ہوئے پیش کی تھی، اس سے متاثر ہونے کی ایک وجہ شاید ہمارا اندرونی خوف بھی تھا۔ موٹی بڑھیا بہت جذباتی انداز میں اپنا موقف بیان کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، ہمیں اس نخلستان نما زرعی رینچ میں آتا دیکھ کر وہ ہماری نیت بھانپ گئی تھی، بھاگی بھاگی باورچی خانہ نما کمرے کے اندر سے محفوظ کی ہوئی پاک چھری لے آئی تھی، جسے مسلمان ذبیحہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، ہماری ہچکچاہٹ ختم کرنے کے لئے اس نے گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے چند سینئر پاکستانیوں کا ذکر بھی کر دیا۔

عید قربان کے دن ہیں۔ پردیسیوں کی عید عموماً پھیکی پھیکی سی ہوتی ہے۔ عام طور پر بجھی بجھی سی گزر جاتی ہے۔ عید کا صحیح مزہ تو اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے درمیان آتا ہے۔ خاندان کے افراد اور دوستوں سے ملاقات، فضا میں عید کی خوشیوں کی لہریں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ قربانی کے گوشت کی مخصوص مہک اور خون کے علاوہ آلائشوں کی بوٹل جل کر ایک فضا بناتی ہیں جو کہ ہماری عید کا خاصا ہے۔ مجھے چند سال پہلے اپنے ہاتھوں سے کی گئی ایک قربانی کی یاد آ گئی ہے جس کا ابتدائی منظر آپ کے لئے پیش کیا۔ دور افتادہ براعظم جنوبی امریکہ کے ایک ساحلی پٹی نما ملک چلی کے آخری ریجن تاراپاکا میں ایک گاؤں نما بستی جسے نخلستان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ قدرے بلندی پر واقع، بے

آب و گیا ویرانے صحرا میں یہ سبزے کا ٹکڑا، ہریالی کی چھوٹی سی چادر بچھی ہوئی ہو جیسے۔عید کے دن عموماً اکثر پاکستانی اسی ٹیلے نما بستی کا رخ کرتے ہیں۔ بالخصوص بڑی عید پر جب قربانی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔اس صورت میں یہ تفریحی مقام ہوتا ہے۔ چند پاکستانیوں نے یہاں ذاتی رانچ بھی خرید رکھے ہیں۔

ساحل سمندر سے گیارہ ہزار میٹر کی بلندی پر واقع اس نخلستان کا نام پیکا ہے اور اس کی آبادی چار ہزار ہے۔میلوں دور تک اس کے اردگرد ویرانہ ہے۔ساحل سمندر کا ذکر اس لیے کیا کہ مجھ سمیت تمام پاکستانیوں کا کاروبار اور رہائش سمندر کے کنارے واقع شہر اقیقے میں ہے،ٹیکس فری زون قرار دیئے جانے کی وجہ سے گزشتہ تقریباً نصف صدی سے دنیا بھر کے سرمایہ داروں کی توجہ کا مرکز اور کاروباری گہما گہمی کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے۔ پیکا نخلستان اس شہر سے ایک گھنٹے کی دوری، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک گھنٹے کی چڑھائی پر واقع ہے۔انتہائی پر فضا مقام ہے۔ یہاں کے لیموں کی ترشی پورے چلی میں مشہور ہے اور یہاں کے آم ہم پاکستانیوں کو بہت پسند آتے ہیں۔اب سات سمندر پار چونسہ، لنگڑا، سندھڑی، دیسی تو یہاں ملنے سے رہے۔چھٹی کا دن اور پھر عید کا تہوار ہونے کے سبب تمام دن چونکہ یہیں بسر کرنے کا ارادہ تھا،اس لئے رانچ کے اردگرد کا ماحول جانچنے کے لئے قربانی کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ ایک مقامی باشندے نے مجھے کہا کہ تمہیں دریا دکھاتا ہوں،اب فارسی میں تو سمندر کو دریا کہتے ہیں اور پھر پانچ دریاؤں کی دھرتی میں جنم لینے کے سبب جب بھی کوئی دریا کا ذکر کرتا ہے تو راوی، چناب، ستلج، سندھ دریا ذہن میں آتے ہیں۔حالانکہ میں نے تو یہ کہیں پڑھ رکھا تھا کہ پیکا میں کوئی گرم چشمہ ہے مگر شاید میرے دوست نے مبالغے سے کام لے لیا ہو۔اب جائے وقوعہ پر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا، جسے وہ دریا Rio کہہ رہا تھا اس سے زیادہ پانی ہمارے گلی محلوں کی نالیوں میں بہہ رہا ہوتا ہے۔میں نے اس سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ بہت فٹے منہ تم پر بھی اور در فٹے منہ تمہارے اس دریا پر بھی۔مگر گردوپیش پر نظر ڈالی تو تمام شکوے شکایتیں جاتی رہیں، قدرت کا حسین شاہکار ہے یہ نخلستان۔

غربت اوراس سے منسلک بے چارگی بھی یہاں کے لوگوں میں جابجا نظر آتی ہے۔ایک خاتون سے پوچھا کہ یہاں کہیں سے تربوز مل سکتا ہے؟ جواب میں کہنے لگی کہ ضرور ملے گا۔یہاں کے تربوز بہت میٹھے اور مزیدار ہوتے ہیں۔میرے پاس جب پیسے ہوتے ہیں تو میں بھی خرید کر شوق سے کھاتی ہوں۔بڑے احسن انداز میں خندہ پیشانی سے اس نے ہماری رہنمائی کی۔مضافات کے لوگوں میں ایک خاص طرح کی بے ساختگی اور گرمجوشی ہوتی ہے، یہ دل نوازی شہروں میں بسنے والے لوگوں میں کم کم پائی جاتی ہے۔یورپ کے دیگر ممالک کی نسبت سپین کے لوگوں میں مسلمانوں سے اجنبیت کم پائی جاتی ہے۔اس کی وجہ ایک ہزار سال پر محیط وہاں عرب مسلمانوں کا اقتدار بھی ہوسکتی ہے۔ہسپانوی زبان پر عربی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔تیس ہزار عربی زبان کے الفاظ کا ہسپانوی لغت کا حصہ ہونا اہم بات ہے مگر میرے نزدیک زبان کی گرامر اور بنیادی قوائد وضوابط کو عربی زبان نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم بات ہے۔مثال کے طور پر ہسپانوی زبان کے دو بہت ہی اہم سابقے ہیں ''EL'' اور ''LA'' یہ دونوں عربی کے ''ال'' اور ''لا'' ہیں۔ہم جس بستی پیکا کا ذکر کر رہے ہیں اس کے صوبے کا نام ال تمارو گال ہے، اور اس نخلستان کو بھی عموماً ''لا پیکا'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔اسی نگری میں پیدا ہو کر پلنے ، بڑھنے والا ایک میرا دوست جو پولیس کیپٹن ہے اور ظالمانہ حد تک صاف گو بھی ہے، کہنے لگا آپ اور ہم ہسپانوی ورثے کے لوگ ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں، یہ میرے کالے بال اور آنکھوں کی رنگت عربوں کی مہربانی سے ہے۔ہمارا اور آپ کا خون ایک ہے۔لاطینی امریکہ میں یہ بات اب بھی فخر کی علامت سمجھی جاتی ہے ،اگر کسی کے آباؤاجداد سپین یا یورپ کے کسی بھی ملک سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوں، آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یورپی پس منظر کے لوگوں نے ہی زیادہ تر لاطینی ممالک پر حکمرانی کی ہے۔مذکورہ پولیس والا دوست بھی نسلی اعتبار سے ہسپانوی ہے۔

واپسی گھر کی طرف لوٹتے ہوئے شام ہوگئی رات کے پہلے پہر صحرا سے آسمان کی طرف دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔رات کو ایسا تاروں بھرا آسمان میں نے دنیا میں کہیں بھی نہیں دیکھا۔یہاں سے

ستارے اور آسمان بہت ہی قریب لگتے ہیں۔اتنے قریب کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تھوڑی سی کوشش کریں تو انہیں با آسانی چھوا جا سکتا ہے۔اس صحرا میں جنگلی حیات کا تو کوئی وجود نہیں اور نہ ہی انسانوں کی کوئی بستی درمیان میں ہے۔دور دور تک کسی ٹریفک کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔میں نے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی اور انجن بند کر کے باہر آ گیا۔بہت دیر تک آسمان کو دیکھتا رہا۔اتنی خوبصورتی زندگی میں کم ہی ایک جگہ یکجا دیکھی ہے۔مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں اپنے زمانہ طالب علمی کے Ecology کے پروفیسر یاد آ گئے۔ایک دفعہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان سے ملنے کالج گیا اور بتایا کہ میں آج کل چلی میں رہ رہا ہوں۔ان کا کہنا تھا کہ میری خواہش مرگ ہے کہ چلی دیکھوں۔ڈیتھ وش کا یہی ترجمہ سمجھ آتا ہے۔انہوں نے ارضیاتی حوالے سے جو باتیں بتائیں وہ اب بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔اور اس علاقے کا انہوں نے ذکر خاص طور پر کیا تھا۔

اب صحرا میں آسمان پر تاروں کا جھرمٹ دیکھا تو ان کی خواہش مرگ والی بات بہتر انداز میں سمجھ میں آئی ہے۔اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت کے سبب دنیا بھر سے سیاح یہاں تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں۔انہی سیاحوں کی آمد کے پیش نظر ایک خوبصورت ہوٹل قائم کیا گیا ہے۔اسے رصدگاہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔کیونکہ اس کو اس انداز میں بنایا اور چلایا جاتا ہے،یعنی رات کا آسمان واضح طور پر دیکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ آسانی ہو سکے۔روشنی اور رنگوں کا انتخاب ایسا کہ قدرتی منظر کی خوبصورتی متاثر نہ ہونے پائے۔آسمان اور ستاروں کی قربت زیادہ سے زیادہ محسوس کی جا سکے۔ہوٹل اور ہوسٹل تو چند ایک اور بھی قابل ذکر ہیں۔مگر اصل کمال تو قدرت کا ہے جس نے اسے یوں تخلیق کیا،اس نخلستان سے رات کو آسمان کی طرف دیکھیں تو تارے زمین پر اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔دھرتی اور آسمان آپس میں ملاپ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

تھائی لینڈ کی ایک صبح

چار گھنٹے کی مسافت طے کر کے فلائیٹ جب لاہور سے بنکاک ائیر پورٹ پہنچ رہی تھی، تو اس لمحے فضا عجب طلسماتی سی بنی ہوئی تھی۔ صبح چھ بجے کا عمل تھا، سرمئی بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی کوئی سورج کی کرن اپنا راستہ بناتے ہوئے ہم تک جہاز کے اندر پہنچ جاتی اور پھر دوبارہ کھڑکی کے شیشے سے باہر تیرتے ہوئے بادل نظر آنے لگتے۔ آخر شب کے اثرات سے ابھی تک آسمان کو مکمل رہائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جہاز اپنی پرواز کی اونچائی مسلسل کم کرتے ہوئے ائیر پورٹ کے رن وے کے قریب پہنچا تو کھڑکی سے شہر کی روشنیاں دیکھ کر بنکاک پر طلسم ہوشربا کا گمان گزر رہا تھا۔ ائیر پورٹ انتظامیہ نے سیاحوں کی سہولت کے لئے مفت وائی فائی انٹرنیٹ فراہم کر رکھا ہے، اس وائی فائی کی ترسیل وحصول بھی انتہائی آسان ہے۔ مسافر بغیر کسی خرچ کے اپنے اہل خانہ اور احباب کو ائیر پورٹ پر پہنچتے ہی اطلاع پہنچا سکتے ہیں، اگر چاہیں تو با آسانی فون پر بات بھی کر سکتے ہیں۔ میں تو اسے بدقسمتی ہی کہوں گا کہ آج کے دن تک پاکستانی ائیر پورٹس پر سیاحوں کے لئے مفت وائی فائی کی سہولت موجود نہیں ہے۔ جس سہولت کی مبینہ فراہمی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ فقط پاکستانی ٹیلی فون کی موبائل سم کے حامل افراد کے لئے مخصوص ہے۔ ہمارے حکام بالا اور متعلقہ افسران سے کوئی شخص پوچھے کہ کسی غیر ملکی سیاح کے پاس پاکستانی ٹیلی فون سم بھلا کیوں کر اور کیسے موجود ہوگی؟ اگر ٹیلی فون سم آپ کے پاس موجود بھی ہو تو لامتناہی سوالات کے سلسلے کے بعد بھی وائی فائی انٹرنیٹ کی سہولت آپ کو میسر نہیں آئے گی۔ ارباب اختیار سے کوئی یہ سوال کرنے کی جسارت کرے کہ سرکار پوری مہذب اور نیم مہذب

دنیامیں ائیرپورٹ پروائی فائی کی فراہمی کے لئے فقط آپ ہی کوسیاحوں کی تقریباً جنم پتری کیوں درکار ہے؟ کتنا خرچہ آتا ہے اس سہولت کی فراہمی پر؟ ایسی باتیں دیکھ کر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید یہ ہماری ترجیحات میں شامل ہی نہیں ہے۔ ورنہ تو شاید نیت اور تھوڑی سی کوشش سے ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں کی جاسکتی ہیں۔ جن پر کوئی خاص خرچ بھی نہیں آتا ہے۔

بنکاک ائیرپورٹ پر اترتے ہی منی ایکسچینج کی بے شمار دکانیں نظر آتی ہیں۔ مقامی کرنسی تھائی بھات ہے۔ آج کل سات پاکستانی روپے ایک تھائی بھات کے برابر ہیں۔ سیاحوں کے ساتھ دوکانداروں کا رویہ بڑا دوستانہ اور مہذب ہے۔ کرنسی تبدیل کرتے وقت آپ کا پاسپورٹ مانگیں گے اور پیسے تبدیل کرنے کے ساتھ آپ کو کمپیوٹر رسید بھی ضرور فراہم کریں گے۔ ائیرپورٹ سے باہر نکلا تو ایک خوبصورت صبح کو اپنا منتظر پایا۔ درجہ حرارت چوبیس ڈگری تھا، یاد رہے کہ جہاز کے اندر کا درجہ حرارت بھی چوبیس ڈگری ہی ہوتا ہے، جو کہ آئیڈیل شمار ہوتا ہے۔ یہاں سال کے تین موسم بیان کئے جاتے ہیں، ان میں پہلا موسم مون سون کا ہے، جس کی شدت اگست اور ستمبر میں ہوتی ہے جبکہ شروع یہ مئی سے ہی ہوجاتا ہے۔ موسم سرما اکتوبر سے فروری تک ہوتا ہے۔ گرمی کا موسم فروری اور مئی کے درمیانی عرصے پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر میری رائے پوچھیں تو موسم یہاں دو ہی ہوتے ہیں، ایک بارش کا موسم اور دوسرا بغیر بارش والا موسم۔ پورا سال آپ ایک سا لباس پہن سکتے ہیں۔ کپڑوں کے ایک جوڑے یا پھرٹی شرٹ کے ساتھ پورا سال ہنسی خوشی گزارا جاسکتا ہے۔ جیکٹ، جرسی، کوٹ کی کوئی ضرورت کبھی بھی اس سرزمین محسوس نہیں ہوتی ہے۔

یہ دیس بہت سرسبز ہے۔ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی سوجھتا ہے کی عملی تفسیر محسوس ہوتی ہے یہ سرزمین۔ خاص طور پر بنکاک شہر سے اگر آپ مضافات کا رخ کریں تو کوئی چپہ بھی سبزے اور ہریالی سے خالی دکھائی نہیں دے گا۔ پام کے دراز قد پیڑ خصوصاً توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں، کیلے کے جھنڈ اور ساگوان کے درخت منظر کا اہم حصہ ہیں۔ طویل قامت بانس جابجا اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ کھیتوں کا تذکرہ کریں تو سب سے مقبول فصل چاول کی ہوتی ہے۔ سڑکوں کے کنارے

کسان چھوٹی چھوٹی دکانیں سجائے تازہ پھل فروخت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔بارشوں کی کثرت کے باوجود کبھی آپ کو کہیں بھی پانی کھڑا ہوا نظر نہیں آئے گا۔صبح سویرے پرندوں کے چہچہانے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ مذہبی اشلوک اور گیتوں،منتروں کی آوازیں بھی سماعتوں سے ٹکراتی ہیں۔تھائی لینڈ بڑا مذہبی ملک ہے۔غالب اکثریت بدھ مت کی پیروکار ہے۔تقریباً نوے فیصد آبادی کا عقیدہ بدھ ازم ہے جبکہ دوسرا سب سے بڑا گروہ مسلمان ہیں،جو کہ چھ فیصد کے قریب ہیں۔عیسائی ملک کی آبادی کا تقریباً ایک فیصد ہیں۔ہندو اور لادین لوگ بھی پائے جاتے ہیں مگر وہ انتہائی قلیل ہیں۔ملک میں آئینی طور پر بادشاہت رائج ہے جبکہ قومی اسمبلی اور سینٹ کے ادارے بھی موجود ہیں اور وزیراعظم بھی ہے۔آپ برطانیہ کی مثال دے سکتے ہیں مگر یہاں بادشاہ کو مذہبی تکریم حاصل ہے۔بادشاہ کو بھگوان کا اوتار مانا جاتا ہے۔کرنسی نوٹوں کے علاوہ پورے ملک میں بادشاہ کی قدآور تصاویر جگہ جگہ آویزاں ہیں۔بادشاہ کا اصل نام تو خاصا مشکل ہے مگر عرف عام میں اسے دسواں راما کہتے ہیں۔

پرانے زمانے میں پانچ لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل اس ملک کو ''سیام'' کہا جاتا تھا۔سات کروڑ نفوس پر مشتمل اس دیس کی سرحدیں ایک طرف تو برما اور کمبوڈیا سے ملتی ہیں تو دوسری طرف لاؤس اور ملائیشیا سے منسلک ہیں۔آبی سرحد ویت نام سے بھی مل جاتی ہے۔تھائی لینڈ اس خطے کا واحد ملک ہے جو کبھی کسی سامراجی قوت کی نوآبادی نہیں رہا ہے۔آزاد منش لوگوں پر مشتمل اس دیس نے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کا ساتھ دیا تھا۔جنگ کے خاتمے کے بعد امریکی بلاک کا حصہ بن گیا۔امریکہ سے قائم ہونے والے دوستانہ تعلقات میں آج بھی ویسی ہی گرم جوشی اور فدویانہ پن ہے۔بر سبیل تذکرہ تھائی کا لفظی مطلب مردِ آزاد ہے۔لوگوں کا طرز بود و باش اور زندگی کا ڈھنگ دیکھیں تو اسم بامسمم محسوس ہوتا ہے۔طرح طرح کی زبانیں بولنے والے لوگ یہاں موجود ہیں مگر تھائی زبان ہی بنیادی رابطے کی زبان ہے۔سرکاری و غیر سرکاری سطح پر تھائی ہی رائج ہے۔ ویسے ملک بھر میں بولی جانے والی زبانیں تو آٹھ ہیں۔آپ کو حیرت میں مبتلا کر دینے والی بات ہوگی کہ ہم یہاں اپنے گاہکوں سے اردو زبان میں بات کرتے ہیں۔میانمار اور تھائی لینڈ کی سرحد پر واقع اس کاروبار میں ہمارے تمام گاہک اردو زبان جانتے ہیں،عمومی طور پر برما سے آتے ہیں مگر اس کی تفصیل پھر کبھی بیان کروں گا۔

تھائی انتخابات

اتوار کی صبح بنکاک ایئرپورٹ سے مضافات کی طرف نکلے تو چھٹی کا دن ہونے کے باوجود غیر معمولی نقل وحرکت محسوس ہوئی۔اس کا سبب ملک میں منعقد ہونے والے عام انتخابات تھے۔تھائی لینڈ میں پانچ کروڑ لوگ ووٹ دینے کے اہل ہیں،جن میں سے اکثریت نے ایوان نمائندگان کے پانچ سو ممبران کو منتخب کرنے کے لئے پولنگ اسٹیشنوں کا رخ کیا۔ویسے تو پاکستان میں بھی یہ عام انتخابات کا سال ہے مگر ملکی حالات دیکھ کر لگتا ہے کہ

این خیال است ومحال است وجنون است

یہاں یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ تھائی لینڈ کی کل آبادی سات کروڑ کے لگ بھگ ہے۔پورے ملک میں امیدواروں کی تشہیری مہم کے باعث رنگوں کی برسات آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔پوری دنیا میں پینافلیکس کی ایجاد نے نشرواشاعت اور پروپیگنڈے کے شعبے میں ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔کاغذ کے پوسٹر اور کپڑے کے بینر اس نئی ایجاد کا کسی طور بھی مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ایک تو یہ دیرپا،یوں کہ موسمی اثرات سے بہتر انداز میں لڑنے کے حامل ہوتے ہیں،بارش اندھیری کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔پھر نسبتاً کم خرچ بھی ہیں۔تھائی لینڈ کے اس بار سفر کا ایک پہلو یہ تھا کہ سڑک کنارے ہر جگہ یہی پینافلیکس قدِ آدم سائز میں لہراتے اور ایستادہ نظر آئے۔یہ ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ یہاں حاضر سروس فوجی اور سویلین سرکاری ملازمین بھی عام انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لے سکتے ہیں۔اس بات کا بھی مجھے یوں پتہ چلا کہ بہت سارے امیدواروں کی

میں نے وردی پوش تصاویران کے انتخابی تشہیری اشتہارات پر دیکھیں جن میں ووٹ کے صحیح حقدار ہونے کی صدادے رہے تھے،تو بے ساختہ سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ جواب میں بتایا گیا کہ یہ نہ صرف قانونی ہے بلکہ ایک بڑی تعداد میں سول اور فوجی افسران اس وقت تک بھی پارلیمان کا حصہ تھے۔ایوان بالا کے 250 افراد فوج منتخب کرتی ہے۔ان نامزد سینٹ ممبران میں بھی اکثر سرکاری ملازمین کی ہوتی ہے۔موجودہ وزیراعظم جو کہ گزشتہ 9 برس سے اقتدار میں ہیں،وہ بھی ایک فوجی جرنیل ہیں۔الیکشن کے اگلے روز ہی یہ خبر ملی کہ وزیراعظم چان اوچا کی جماعت بری طرح ناکام ہوئی ہے اور چوتھے نمبر پر بمشکل 36 نشستیں جیت سکی ہے۔پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والی جماعتیں جمہوری نظریات رکھتی ہیں اور فوج کے سیاسی کردار کی مخالف ہیں۔ان جماعتوں نے پانچ سو کے ایوان میں بالترتیب 152 اور 141 نشستیں جیتی ہیں مگر پھر بھی یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اقتدار بھی ان کو ہی ملے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وزیراعظم کا انتخاب سینٹ اور ایوان نمائندگان مل کر کرتے ہیں اور سینٹ کے نمائندگان کی نامزدگی فوج کرتی ہے۔ساٹھ دن کے اندر الیکشن کمیشن انتخابی نتائج کا اعلان کرنے کا پابند ہے اور محولہ بالا انتخابی نتائج غیر حتمی اور غیر مصدقہ ہیں۔ابھی ہونٹوں اور پیالی کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

یہ تذکرہ برمحل ہوگا کہ 2014 میں فوج نے منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا، ینگ لک شنووترا کو اقتدار سے رخصت کرنے سے پہلے ان کے بھائی بھی اقتدار سے فوج کے ہاتھوں رخصت ہو چکے ہیں۔دونوں طویل عرصے سے جلاوطنی میں ہیں۔ان انتخابات میں ان کی سیاسی جماعت دوسرے نمبر پر آئی ہے۔تھائی لینڈ کی مقامی سیاست کی تفصیل میں جانے سے پہلے عرض کردوں کہ یہاں آئینی بادشاہت رائج ہے۔بادشاہ نہ صرف مکمل اختیارات کا منبع و مرکز ہے بلکہ اسے مذہبی تکریم بھی حاصل ہے۔بدھ مت کے پیروکار ملکی آبادی کا ترانوے فیصد ہیں جن کے نزدیک بادشاہ خدا کا اوتار ہے،آپ اس کا نمائندہ یا پھر بھگوان کا روپ ،بھگوان سمان بھی کہہ سکتے ہیں۔دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے جو کہ تقریباً چھ فیصد ہے جبکہ دیگر مذاہب مجموعی آبادی کا ایک فیصد حصہ

ہیں۔ملک کے طول وعرض میں بادشاہ اور ملکہ کی جہازی سائز کی تصاویر نصب ہیں۔سچ پوچھیے تو انتخابی دنگل عروج پر ہونے کے باوجود مجھے بادشاہ اور ملکہ کی نصب تصاویر تمام منظرنامے پر غالب نظر آئیں۔یہاں شاہی خاندان بدلتے رہتے ہیں۔مگر صدیوں سے بادشاہت ہی رائج رہی ہے۔موجودہ شاہی خاندان کو برسر اقتدار آئے ہوئے ایک صدی گزر چکی ہے۔پانچ لاکھ مربع کلومیٹر پر پھیلے ہوئے اس دیس کا قدیم نام ''سیام'' ہے۔دنیا کا پچاسواں بڑا یہ ملک،تاریخ دان بتاتے ہیں کہ آج سے ہزار،ڈیڑھ ہزار سال پہلے چین سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں نے بسایا تھا۔

پھل یہاں بے شمار انواع واقسام کے پائے جاتے ہیں۔سارا سال موسم تقریباً ایک سا رہتا ہے۔یعنی پورا برس آپ ٹی شرٹ میں با آسانی گزار سکتے ہیں۔بارشیں زیادہ ہونے کی وجہ سے سبزہ بے پناہ ہے۔اردو کے محاورے برسات کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی سوجھتا ہے کی عملی تفسیر ہے۔ہر طرف لہلہاتے کھیت اور درخت۔آم یہاں بہت پائے جاتے ہیں مگر زیادہ تر پھیکے ،پپیتا بھی مقبول ہے مگر میرے دل سے اتر چکا ہے۔اسے پھل کہنا مبالغہ آرائی سمجھتا ہوں،البتہ کوکونٹ بہت مزیدار ہیں۔مناسب دام میں پانی سے بھرے ناریل کا سر قلم کر کے اس میں سٹرا لگا کر دے دیتے ہیں۔پہلے ٹھنڈے میٹھے ناریل سے لطف اندوز ہونے کے بعد چمچ سے اس کی تازہ اور نرم گری جسے گودا بھی کہا جا سکتا ہے،جو بھی کھاتے ہیں ان کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔طرح طرح کے سوپ مقبول اور مزیدار بھی ہیں۔اچھی بات یہاں یہ ہے کہ مقامی آبادی میں مسلمانوں کی قابل ذکر تعداد کے سبب حلال کھانا با آسانی ہر جگہ مل جاتا ہے۔سیاحت کی غرض سے آنے والے مسلمان بالخصوص عربوں کی ایک کثیر تعداد کی وجہ سے بھی حلال کھانے کی دستیابی یہاں بے حد آسان ہے۔تھائی کھانے مجھے تو بہت مزیدار لگے باقی پسند اپنی اپنی ہے۔برسوں پہلے زمانہ طالب علمی میں جب ہمارے کالج کا ٹور اس طرف آیا تو ہم پاکستانی کھانوں کی تلاش میں تھے۔اسی سلسلے میں اپنے ہوٹل میں واقع کپڑے کی دکان کے سکھ مالک سے بات کی تھی۔سردار جی نے پاکستانی ریستوران کا پتا تو بتا دیا لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ یار! آپ لوگ پاکستانی کھانے تو کھاتے ہی رہتے ہیں اور آئندہ بھی

کھائیں گے، یہاں اتفاق سے آ گئے ہیں تو تھائی کھانے کی لذت سے آشنائی حاصل کریں، نیا تجربہ ہی سہی۔اس سکھ کی بات دل کو لگی اور ہمیشہ کے لئے پلے باندھ لی۔اس سے نا صرف طرح طرح کے غیر ملکی پکوانوں سے تعارف ہوا بلکہ سفر کرنا بھی آسان ہو گیا۔

تھائی لینڈ کی مقامی کرنسی بھات کہلاتی ہے جو کہ ہمارے آٹھ روپے کے برابر ہے۔طویل عرصے سے مستحکم معیشت ہے۔حالانکہ اس ملک کی سب سے بڑی انڈسٹری سیاحت ہے اور کووڈ 19 نامی کرونا وبا نے تو دو سال کے لئے پوری دنیا میں سیاحت صفر کر کے رکھ دی تھی۔یہاں کے بڑے بڑے ہوٹل، سیاحتی مقامات اور یہاں تک کہ تھائی ایئر لائن بھی زمین بوس ہو گئی تھی۔مگر آہستہ آہستہ سب کچھ واپس اپنے قدموں پر آ گیا اور اب پھر سے بازاروں میں غیر ملکی سیاحوں کی وہی چہل پہل بحال ہو گئی ہے جو کہ کرونا وبا کے پھیلاؤ سے پہلے تھی۔تھائی لینڈ کی سرحدیں میانمار، لاؤس، کمبوڈیا اور ملائیشیا سے ملتی ہیں جبکہ سمندری سرحد ویت نام اور انڈونیشیا کے علاوہ ہندوستان سے بھی ملتی ہیں۔ملک کا معیاری وقت پاکستان سے دو گھنٹے آگے ہے جبکہ مجھے یہ فرق زیادہ محسوس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے زیادہ آگے ہے۔خارزار سیاست کی بات ہو رہی تھی، یہ عرض کر کے اجازت چاہوں گا کہ موجودہ انتخابات آئندہ پانچ سال کی مدت کے لئے نمائندے منتخب کرنے کے لئے انعقاد پذیر ہوئے تھے۔سیاست کی خوبصورتی ہے کہ کبھی بور نہیں ہونے دیتی اور ہمیشہ جوان رہتی ہے۔دیکھیں آئندہ منظر نامہ کیا بنتا ہے۔

مائی سوت اور روہنگیا

پہلی بار نام سنا تو مائی سوت پر مجھے شہر کی بجائے کسی بزرگ خاتون کے تذکرے کا گمان گزرا۔ بنکاک سے پانچ سو کلومیٹر کی مسافت طے کرنے میں پانچ، چھ گھنٹے لگ ہی جاتے ہیں۔ اگرچہ تھائی حکومت نے موٹروے بڑا ہی اچھا تعمیر کیا ہے، جو دو شہروں کو آپس میں جوڑتا ہے۔ تمام راستہ ایسا سرسبز ہے جیسے اردو محاورے کے مطابق ساون کے اندھے کو ہر طرف سوجھتا ہے۔ چاروں طرف ہریالی کا راج ہے اور سبزے میں مکمل ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے بیچ یہ چھوٹا سا شہر اس وادی نما کا مرکزی نقطہ ہے۔ شہر کے ایک طرف ندی گزرتی ہے جسے دریا کہنا مبالغہ ہوگا اور نالہ لکھ کر میں اس کی تصغیر نہیں کرنا چاہتا۔ ندی کے پار دوسری طرف میانمار ہے، جسے ہم بچپن سے برما کے نام سے جانتے ہیں، جو کسی زمانے میں ہمارا ہمسایہ ملک ہوا کرتا تھا۔ ندی کے پار کنارے بڑی خوبصورت عمارتیں نظر آتی ہیں، ان فن تعمیر کا شاہکار رنگا رنگ دو منزلہ عمارتوں میں کسینو بنے ہوئے ہیں، جن میں جوا کھیلنے کے لئے پورے ملک کے طول و عرض سے تھائی باشندے جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سرحد پار کرتے ہیں، قمار خانوں کے مالکان یہ کشتی سروس مفت فراہم کرتے ہیں، اگر آپ اپنی آمد سے پہلے ہی مطلع کر دیں۔ اس رونق کی وجہ یہ ہے کہ تھائی لینڈ میں قمار بازی پر پابندی عائد ہے جبکہ میانمار یہ کوئی ایسا قابل تعزیر جرم نہیں ہے۔ جس طرح یہ جوا خانے ندی کے کنارے قائم کئے گئے ہیں، ان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ خصوصی طور پر تھائی باشندوں کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔ کرونا وبا کے دنوں میں عین سرحد پر قائم ان

قمار خانوں کو بند کر دیا گیا تھا، جو ابھی تک کھلنے کے منتظر ہیں۔

تھائی لینڈ میں جوئے پر اتنی سخت پابندی ہے کہ اگر آپ سے تاش کے پتے بھی برآمد ہو جائیں تو آپ مسائل کا شکار ہو سکتے ہیں۔اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ ایک پہاڑی دامن میں باربی کیو سے واپسی پر تاش کے پتے ایک نوجوان کو دیتے ہوئے یہ نصیحت کرتے ایک سمجھدار جواری کو سنا، جو کہہ رہا تھا کہ یہ تاش کی گڈی گاڑی میں مت پڑی رہنے دینا، گھر جا کر نکال لینا، چونکہ اگر کہیں پولیس نے تلاشی کے دوران برآمد کر لی تو مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔اس دور افتادہ نگری میں میری آمد کا مقصد بنیادی طور پر سیاحت نہیں ہے، اگرچہ یہ خطہ جنت نظیر ہے مگر میں یہاں ری کنڈیشن گاڑیوں کی تجارت کے سلسلے میں آیا ہوں۔اس شہر میں مقیم تقریباً تمام پاکستانیوں کا تعلق اسی تجارت کے ساتھ ہے۔کبھی کبھی کوئی سیاحت کے لئے بھی آ جاتا ہے مگر ان کا بنیادی مقصد بھی عموماً گاڑیوں کے کام کا جائزہ لینا ہی ہوتا ہے، یا پھر سرحد پار برلب نہر قمار خانوں میں جوا کھیلنا مقصد ہوتا ہے۔آج ہمارے ایک عزیز دوست نے کالی مرچ میں گوشت پکا کر ہمارے اعزاز میں ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں درجن بھر پاکستانی شریک ہوئے۔عزیزی احتشام بٹ اور باؤ جی کی فرمائش تھی کہ ان کے شہر مائی سوت کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ خوبصورت شہر جسے جنت نظیر کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگی، اس قابل ہے کہ اس کی مداحی میں پوری کتاب بآسانی تحریر کی جا سکتی ہے، تب جا کر ہی اس کے قدرتی حسن سے مالا مال مناظر کا احاطہ ممکن ہوگا، حق تو پھر بھی شائد ادا نہ ہو سکے گا۔بلند پہاڑوں میں گھری وادی نما یہ شہر ہے تو چھوٹا سا مگر صاف ستھرا اور انفراسٹرکچر ایسا ہے کہ بڑے بڑے شہروں کو مات دیتا دکھائی دیتا ہے۔

کہساروں میں گرم پانی کے چشمے ابلتے ہیں۔بہتے چشموں کے اردگرد سرائے قائم ہیں۔دنیا بھر سے اگر نہیں بھی تو دور دراز سے لوگ یہاں تھکن اتارنے کے لئے ٹھہرتے ہیں، بڑے مناسب نرخوں پر مہمان کی تواضع کی جاتی ہے۔مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ ایسے پر تکلف اور بہترین سروس فراہم کرنے والے کیفے ٹیریا اپنے اخراجات کیسے پورے کرتے ہوں گے؟ وجہ اس سوال کی یہ

بھی ہے کہ لوگوں کا رش بالکل بھی نہیں ہے۔ جہاں جہاں بھی گئے ہمارے علاوہ چند ایک گاہک ہی نظر آئے، جبکہ ملازمین چاک وچوبند اور خوش اخلاق ملے اور یہ تاثر بھی نہیں ملا کہ یہ ریستوران بند ہونے جا رہا ہے۔ یہ مہنگے بالکل بھی نہیں ہیں۔ مناسب نرخوں پر تواضع کی جاتی ہے۔ حالانکہ ان دنوں آٹھ پاکستانی روپے میں ایک تھائی باٹ آتا ہے، مگر پھر بھی مہنگائی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اردگرد پہاڑوں پر نظر دوڑائیں تو انسان مبہوت رہ جاتا ہے کہ اس قدر قدرتی حسن بھی ممکن ہے؟ ایک اچھی بات یہ ہے کہ یہاں چوری چکاری کا رواج نہیں ہے۔ لوگ گھروں سے جاتے وقت عموماً تالے بھی نہیں لگاتے ہیں۔ اگر کسی کی کوئی چیز کہیں گر گئی ہے تو امکان زیادہ یہی ہے کہ وہیں پڑی رہے گی، تلاش کرنے پر مل جائے گی۔ تھائی لینڈ کے لوگوں میں اور کئی خرابیاں ہو سکتی ہیں مگر یہ لوگ چور نہیں ہیں۔

بھنگ کے استعمال کی اجازت ملک بھر میں دے دی گئی ہے۔ بظاہر اس کا مقصد سیاحت کا فروغ ہے۔ بنکاک شہر میں تو مصروف ترین سڑکوں کے کنارے ٹرکوں اور کیمپ ویگنوں میں ''ماری گوانا کیفے'' قائم ہیں۔ جن میں بیٹھ کر پکا سگریٹ پیا جا سکتا ہے۔ مائی سوت میں البتہ منظر مختلف ہے۔ آج سوئے اتفاق سے ایک ایسے ہی کیفے میں جانا ہوا۔ میرے ساتھ بھانجا شانی بھی تھا۔ سگریٹ کے علاوہ وہاں بھنگ والے بسکٹ بھی دستیاب تھے۔ کیفے کے مالک نے ہمیں بتایا کہ اگر آپ سگریٹ نہیں پینا چاہتے تو کوئی بات نہیں، ہمارے پاس بھنگ والے کیک اور بسکٹ کے علاوہ بھنگ کا تیل بھی دستیاب ہے۔ عمومی چرسیوں کی طرح حلیم الطبع اس شخص نے سمجھایا کہ کیسے سونے سے پہلے صرف دو قطرے بھنگ کے تیل کے زبان پر ڈالیں تو بڑی گہری، اچھی نیند آئے گی اور ساری منفی چیزیں جسم سے رات بھر میں ان دو قطروں کے طفیل کوچ کر جائیں گی اور صبح تازہ دم اٹھیں گے۔ ہم نے اس اخلاص کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ فی الحال آپ ہمیں دو کپ سادہ کافی ہی پلا دیں۔ یہاں لڑائی جھگڑے کا رواج بالکل بھی نہیں ہے جس کی وجہ بدھ مت کی پیروی کے علاوہ بھنگ کی اجازت بھی ہو سکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مائی سوت کی آدھی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ تھائی لینڈ کی مجموعی

آبادی میں مسلمانوں کا تناسب چار فیصد ہے جبکہ بدھ مت نوے فیصد اور عیسائی تین فیصد ہیں۔اسلام تھائی لینڈ کے لئے اجنبی نہیں ہے مگر اس شہر میں مسلمانوں کی آدھی ہونے کا سبب برمی مسلمان ہیں۔میانمار سے آکر اس طرف آباد ہونے والوں میں غالب اکثریت روہنگیا مسلمانوں کی ہے، جنہیں یہاں عمومی طور پر ''ارکانی'' کہا جاتا ہے۔ایک روہنگیا دوست سے میں نے یہ پوچھا کہ ارکانی اور روہنگیا میں کیا فرق ہے؟ صبح صبح کا وقت تھا اور اس کے پاس بھی لگتا تھا کہ کافی فارغ ٹائم ہے، میں نے اسے دفتر میں بٹھا کر کافی پلائی اور ہم تادیر روہنگیا مسئلے کی ابتدا اور اس کی جہتوں پر گفتگو کرتے رہے۔روہنگیا میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور اسے دنیا بھر میں سب سے زیادہ زیر عتاب اقلیت قرار دیا جاتا ہے۔ان کے علاوہ نسلی تعصب کو سرکاری سرپرستی اور قانونی حیثیت حاصل ہے، اس کا جنوبی افریقہ کے ماضی میں ریاستی جبر سے موازنہ کیا جاتا ہے۔مذکورہ دوست چونکہ گاڑیوں کا تاجر اور ہمارا گاہک بھی ہے اس لئے ایک قربت کا احساس پیدا ہونا فطری عمل ہے، مشترکہ کلمہ اور ایک ہی زبان بھی اس انسیت کی وجوہات میں شامل ہیں۔اس نے مجھے سمجھایا کہ روہنگیا ہماری ذات ہے، آپ قوم بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ ارکان ہماری ریاست اور علاقے کا نام ہے، اگرچہ کچھ سال پہلے فوجی حکومت نے اس صوبے کا نام ارکان سے تبدیل کر کے راکھائین رکھ دیا ہے مگر پھر بھی لوگوں میں نیا نام قبولیت حاصل نہیں کر سکا اور پرانے نام کی نسبت سے ہی ہمیں اب بھی ارکانی کہا جاتا ہے۔

روہنگیا بنیادی طور پر تواِنڈو آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر یہ لوگ صدیوں سے میانمار کے ارکان صوبے میں آباد ہیں۔ان کی اپنی الگ شناخت اور زبان ہے۔برما کی ریاست سیاسی و مذہبی وجوہات کی بنیاد پر ان سے جو تعصب برتتی ہے اس پر ایک الگ مضمون درکار ہے۔روہنگیا کے خلاف اس ظلم میں شدت ۱۹۷۸ میں آئی جب ان کی شہریت منسوخ کر دی گئی اور دس لاکھ روہنگیا بنگلہ دیش ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔مائی سوت شہر کی ایک خاص بات انہی روہنگیا ارکانی مہاجرین کی پچپن ہزار کے قریب آبادی ہے۔انہی کا فیض ہے کہ اس چھوٹے سے تھائی شہر میں حلال کھانا پینا بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔مساجد میں رونقیں ہیں اور خوبصورت پہلو ایک یہ بھی ہے کہ چاہے ٹوٹی پھوٹی ہی سہی یہ ہمارے ساتھ اردو زبان میں بات کرتے ہیں۔

جنوبی کوریا میں کیا دیکھا

شہروں کے انتخاب کا معاملہ خاصا ٹیڑھا ہے۔کسی سیاح سے اگر یہ پوچھا جائے کہ اس کا پسندیدہ شہر کون سا ہے؟ تو اس کے جواب کا ممکنہ انحصار اس بات پر ہوگا کہ اس دن اس کی صحت، طبیعت کیسی تھی؟ واش روم کیسا استعمال کیا؟ یعنی وہ کس قدر صاف ستھرا یا گندہ تھا۔استراحت کی جگہ کس قدر آرام دہ یا تکلیف دہ تھی؟ البتہ شہر کے لوگوں کے بارے میں بات کرنا قدرے آسان ہوتا ہے۔وہ یوں کہ کوئی بھی نگری اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی اور برے لوگوں سے مبرا بھی نہیں ہے۔کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ بستیوں میں بھلے اور برے لوگوں کے تناسب کا ہی فقط فرق ہوا کرتا ہے، ہر قریے میں پائے دونوں رنگ اور طرز کے لوگ جاتے ہیں۔کہیں اچھے لوگ اکثریت میں ہوتے ہیں تو کہیں اقلیت میں نظر آتے ہیں۔

جنوبی کوریا کے سفر کا ارادہ باندھنے کے بعد پہلا جھٹکا تو مجھے اس وقت لگا جب ٹریول ایجنٹ نے ٹکٹ بھجوایا۔ائیر لائن کا نام پڑھا تو ششدر رہ گیا۔آپ بھی سنیے گا ''جن ائیر'' جی ہاں! یہی نام ہے ہماری پرواز کا اہتمام کرنے والوں کا۔اب خدا معلوم جوجن اور بھوتوں کے قصے ہم نے بچپن سے سن رکھے ہیں، اس ائیر لائن کا ان جنات و بلیات کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہے کہ نہیں، مگر بقول شاعر

؎ اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

خیریت مگر یہ گزری کہ ٹوکیو سے شروع ہونے والے اس ہوائی سفر میں منزل مقصود تک البتہ کسی ''ہوائی چیز'' کے ساتھ کوئی معاملہ پیش نہیں آیا ہے، جس کے لئے میں جنوبی کوریا کی جن ائیر لائن کا تہہ دل سے

شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں۔جنوبی کوریا کا دارلحکومت سیئول ہے مگر بین الاقوامی ہوائی اڈا انچون شہر میں ہے جو کہ اس کا ملحقہ شہر ہے۔آپ سیئول اور انچون کی مثال راولپنڈی اور اسلام آباد کی لے سکتے ہیں،مگر ہمارے ملک کے دارلحکومت اور اس سے ملحقہ شہر میں زیادہ فرق ہے،جڑواں تو پنڈی اسلام آباد ضرور ہیں مگر طرز بود و باش،انفراسٹرکچر اور دونوں شہروں کی ثقافت میں بے پناہ تفاوت ہے جبکہ سیئول اور انچون نہ صرف کہ آپس میں جغرافیائی اعتبار سے جڑواں ہیں بلکہ ثقافتی،سماجی اور دیگر تمام حوالوں سے بھی ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔آپ اسے ایک ہی شہر کہہ سکتے ہیں،اس میں جنوبی کوریا کی آدھی آبادی یعنی سوا پانچ کروڑ نفوس کا نصف بستی ہے،جو کہ اسے دنیا کا چوتھا بڑا شہر بنا دیتی ہے۔یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ سیئول کو دنیا کا چوتھا گنجان ترین دارلحکومت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

جنوبی کوریا زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلات پر مشتمل جزائر کا مجموعہ ہے،اس کے دیگر اہم شہر دائی گو اور بوسان ہیں۔مجھے کوریا کی سیاحت کی دعوت البتہ ایک قدرے چھوٹے شہر پوہان سے آئی تھی۔ایئرپورٹ پر مجھے لینے کے لئے دیرینہ دوست چوہدری راشد نصیر فلائیٹ پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔جیسے ہی انچون کے عالمی ہوائی اڈے پر قدم رکھا تو ان کی کال آ گئی کہ وہ باہر میرے منتظر ہیں۔کورین حکومت نے یہ بڑا اچھا اہتمام کیا ہے کہ کسٹم پار کرتے ہی کئی کرنسی تبدیل کرنے کی دوکانیں بنائی ہوئی ہیں اور پھر وہیں پر ٹیلی فون کی سم یا پھر انٹرنیٹ چلانے کے لئے فوری دستیاب ای سم فراہم کرنے کے کاؤنٹر بنا رکھے ہیں۔جو کہ ارزاں نرخوں پر با آسانی فوری طور پر سیاحوں کو فراہم کر دی جاتی ہیں۔بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم سی باتیں ہیں مگر ایک سیاح اور غیر ملکی کی نظر سے دیکھیں تو ان کی بہت اہمیت ہے۔ایک مقصد اس تحریر کا تو ہم وطنوں کے لئے رہنمائی کی فراہمی ہے،جبکہ دوسرا مقصد اپنے ارباب اقتدار کو ترغیب دلانا ہے کہ ٹورازم کے فروغ کے لئے ایسے کم خرچ مگر اہم اقدام ضرور اٹھائیں جو سیاحوں کو سہولت اور راحت پہنچانے کا سبب ہیں۔

کوریا کی تاریخ پر بات کی جائے تو ان جزائر پر تیس لاکھ سال پہلے زندگی کے آثار ملتے

ہیں۔جدید تاریخ کا تذکرہ کیا جائے تو چینی مورخین کے بیان کے مطابق سات سو سال قبل از مسیح میں یہاں بادشاہت قائم ہو چکی تھی۔بادشاہت کا یہ سلسلہ 1910 میں جاپان کے کوریا پر قبضے تک کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔جاپان کے قبضے سے پہلے دو حکمران خاندان مسند اقتدار پر آٹھ صدیوں تک براجمان رہے۔

آج کے جنوبی کوریا کی بات کریں تو یہ دنیا کی بارہویں بڑی معیشت ہے،اسی بنیاد پر یہ G20 جو کہ دنیا کی بیس سب سے بڑی معیشتوں کی ایک تنظیم ہے،اس کا اہم رکن ہے،اس کے علاوہ پیرس کلب اور OECD کا رکن ہے۔جنوبی کوریا اس وقت دنیا کا نواں بڑا ایکسپورٹر ہے،اس کے باوجود کہ قدرتی وسائل یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔سچ جانیے یہ معاشی معجزہ اس ملک کی عوام کی شب وروز کی محنت اور حکومت کی دانشمندانہ حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔حکومتی پالیسیوں کا تذکرہ میں نے اس لئے کیا کہ دارالحکومت سیول سے ذرا پرے ہی پہاڑیوں کے اس پار شمالی کوریا ہے۔میری دانست میں وہاں کے لوگ بھی کم محنتی اور کم درجے کا ذہن نہیں رکھتے ہوں گے مگر وہ ایک فاقہ زدہ ملک کی شہرت رکھتا ہے۔ایٹم بم اور میزائل ٹیکنالوجی کی جدید ترین سطح پر موجود ہونے کے باوجود معاشی بدحالی کا شکار ہے۔آج دوپہر ایک کورین دوست سے بات ہو رہی تھی۔بتانے لگا کہ جب 1951 کی کورین جنگ ہوئی تو اس وقت شمالی کوریا کے لوگوں کا عمومی قد،کاٹھ جنوبی کوریا کے لوگوں کی نسبت خاصا طویل تھا،اب صورتحال یہ ہے کہ جنوبی کوریا کے باشندوں کا عمومی قد واضح طور پر اپنے شمالی کوریا کے ہمسائیوں سے زیادہ ہے۔ایک ہی زبان،ایک ہی طرز بود و باش مگر ان کے پست قد کی وجہ خوراک کی کمی ہے،غذائی قلت کی وجہ سے شمالی کوریا کے لوگوں کا اوسط قد جنوبی کوریا کے لوگوں سے چھوٹا رہ گیا ہے۔

اس ملک کی 56 فیصد آبادی لادین ہے۔تاریخی اعتبار سے کوریا بدھ مت کا پیروکار رہا ہے،مگر اب عیسائیوں کی تعداد زیادہ ہے،جو کہ آبادی کا 27 فی صد ہیں،جبکہ بدھ مت کے ماننے والے پندرہ،سولہ فیصد رہ گئے ہیں۔عیسائی آبادی کے اضافے کی ایک وجہ یہاں امریکی افواج

کا طویل عرصے سے قیام بھی ہے۔تقریباً تیس ہزار امریکی فوجی دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے یہاں موجود رہتے ہیں۔شہروں میں جگہ جگہ صلیبیں گڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔آج کل پوری دنیا میں کوریا کا ایک نیا تعارف اس کا پاپ کلچر، میوزک، ڈرامے اور فلمیں بنی ہوئی ہیں، اسے عرف عام میں ''کورین ویوو'' کہا جاتا ہے۔کوریا کی یہ ثقافتی لہر جاپان اور امریکہ میں بالخصوص محسوس کی جارہی ہے۔

ہمارے صحافی اور ادیب دوست اکثر جب کسی معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی ترقی کا راز بھی بیان ضرور کردیتے ہیں۔میرا نقطۂ نظر اس بابت ذرا مختلف ہے، ترقی کا کوئی خفیہ راز اور شارٹ کٹ نہیں ہوتا ہے جب آپ ریاستی سطح پر بات کرتے ہیں۔البتہ کوریا کی ترقی کی وجوہات میں سے ایک وجہ اس کا شرح پیدائش دنیا میں سب سے کم ہونا بھی ہے، یہی شاید سبب ہے کہ وہ دنیا میں طویل ترین عمر پانے والی اقوام میں سے بھی ہیں۔کوریا کی وجۂ تسمیہ کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔یہاں گوریو نام کی خاندانی بادشاہت گزری ہے، جس کے بعد اس جزیرہ نما کو اسی نام سے یاد کیا جانے لگا۔جب عرب اور ایرانی تاجر اس نام کو پکارتے تو اس کا تلفظ کوریا ہوتا تھا۔یہیں سے عالمی نقشوں میں پانچ صدیاں پہلے یہ خطہ ارضی کوریا کے نام سے ابھرا تھا۔اس خطے کو KOREA اور COREA دونوں طریقوں اور ہجوں کے ساتھ تحریر کیا جاتا تھا، مگر جب کوریا کو جاپان نے اپنی نوآبادی بنالیا تو حروف تہجی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، جاپانیوں نے KOREA کے یہ ہجے لازمی قرار دے دیے۔چونکہ ''C'' کے ساتھ کوریا لکھنے سے وہ حروف تہجی کے اعتبار سے جاپان سے پہلے آتا تھا، جو کہ شاید جاپانیوں کو پسند نہ تھا۔جاپان کی حکومت تو 1945 میں اس کی دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جزیرہ نما کوریا سے ختم ہوگئی مگر ہجے پھر وہی مستقل اختیار کر لئے گئے جو جاپانی لازمی قرار دے گئے تھے۔

کوریا پہلی نظر میں مجھے بالکل جاپان جیسا لگا۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ گزشتہ صدی کا تقریباً پہلا نصف حصہ جاپان کا اس جزیرہ نما پر قبضہ رہا، جس دوران نا صرف جاپانی زبان لازمی

قراردے دی تھی، بلکہ تمام ملک کاانفراسٹرکچربھی جاپانی طرز پرتعمیرکیا گیاتھا۔یہ مماثلت تو نظر بظاہر حدتک سہی،اس ملک کی دستاویزات اورنظام مملکت پر جاپان کی بڑی گہری چھاپ نظرآتی ہے۔جب جاپان یہاں سے رخصت ہواتو کوریا کو فاتحین یعنی امریکہ اورسوویت یونین نے آپس میں تقسیم کرلیا۔سوویت روس کے حصے میں آنے والے شمالی حصے میں کیمونزم رائج کردیا گیا، جوکہ اب تک ویسے ہی نافذالعمل ہے۔جنوبی حصے میں امریکہ بہادر نے کھلی منڈی اورامریکی طرز کی جمہوریت نافذکردی۔یہ جمہوریت اب ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد مضبوط نظرآرہی ہے۔جنوبی کوریا کے سماج میں اپنی جڑیں پکڑگئی ہے۔

کوریا کی ایک جھلک

منفی آٹھ ڈگری درجۂ حرارت کی سردی میں کیسی شدت اوراذیت ہوتی ہے؟اس حقیقت سے سندھ ساگر کے اردگرداور پنجاب کے میدانوں میں بسنے والے میرے ہم وطن نا آشنا ہیں۔ یہ موسم مگر جنوبی کوریااورخصوصاًسئیول ،انچون کے باسیوں کے لئے غیرمعمولی اورغیرمانوس نہیں ہے۔سردیوں میں عموماًدرجۂ حرارت یہاں منفی میں ہی رہتا ہے،اس لئے آج کا دن دسمبر کے دنوں میں معمول کاروز ہے۔حیرت اوررشک میں مبتلا کردینے والی اس دیس میں بے شمار باتیں ہیں۔ان میں سے ایک وطن پرستی کا جذبہ اورلوگوں کی قومی سوچ ہے۔عوام میں وطن پرستی کا جذبہ اس قدرنمایاں ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیرکوریاکے سفرکی روداد چاہے جتنی بھی بھرپوراور تفصیلی تحریرکردی جائے،ادھوری ہی تصورکی جائے گی۔ ہر دیگر بات ’’اوری نارا‘‘ سے شروع کرتے ہیں۔جس کا ترجمہ ’’ہمارے ملک میں‘‘ کیا جاسکتا ہے،جوکثرت استعمال کی وجہ سے کورین قوم کا تکیہ کلام محسوس ہوتا ہے۔کوریاکےلوگ عمومی طور پر جب اپنی مادرگیتی کا ذکرکرتے ہیں تو ’’اوری نارا‘‘،یعنی ہمارے دیس میں تویوں ہے، یوں ہوسکتا ہے۔کوئی بھی اچھی چیز دیکھتے ہیں جوکسی بیرونی ملک کی ساختہ ہوتو پہلا تاثر یہ ہوگا کہ یہ تو ہم بھی بناسکتے ہیں،ایسی مصنوعات تو ہمارا ملک بھی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔سائنس وٹیکنالوجی کی مصنوعات سے لیکرآٹوموبائل اور ہمہ قسم کی مشینری پرکسی سے بھی گفتگوکرکے دیکھ لیں،کورین کی بات کا آغاز ہی چیز کا جائزہ لینے کے بعد غیرملکی ساخت کی حامل شے بارے یہیں سے ہوگا کہ یہ تو ہمارا ملک بھی بناسکتا ہے۔حالانکہ میں کورین زبان نہیں جانتااس کے

باوجود یہ لفظ اتنے تسلسل سے کانوں میں ٹکراتا ہے کہ ''اوری نارا'' قومی تکیہ کلام قرار دینے کو جی چاہتا ہے۔

ملکوں کے نام کورین زبان میں منفرد اور ذاتی تخلیق کردہ ہیں۔جیسے امریکہ کو ویگو کہتے ہیں۔جی ہاں! وہی ڈالے والا ویگو۔برطانیہ عظمیٰ یونگو ہے تو جاپان ای پون کہلاتا ہے۔میرے لئے یہ بات دلچسپی کا باعث تھی کہ جاپان کے لئے کورین زبان میں جو لفظ رائج ہے،اس کا مطلب ''نمبر 1'' ہے۔اس لفظ کے رائج ہونے کے تاریخی اسباب تو شاید یہ ہوں گے کہ گزشتہ صدی کا پہلا نصف حصہ کوریا زیادہ تر عرصہ جاپان کی نوآبادی رہا ہے،حکمران جاپانیوں کے نزدیک یقیناً ان کی دھرتی ہی دنیا میں پہلے نمبر کا ملک تھا اس لئے انہوں نے یہ بزور شمشیر رائج کروادیا ہوگا۔دوسرا نظریہ اس بابت یہ ہے کہ قربت اور جغرافیائی مماثلت کے پیش نظر شائد جاپان معاشی و معاشرتی ماڈل ان کے نزدیک زیادہ قابل تقلید تھا۔سماجی اور قدرتی حالات بھی جزائر کے مجموعے جاپان اور جزیرہ نما کوریا کے بہت ملتے جلتے ہیں جس کے پیش نظر بزرگوں نے جاپان کو نمبرون ماڈل قرار دے دیا ہوگا۔کاروباری تدریس کے مضمون میں تحقیق کے طالب علموں کو (SRF) سیلف ریفرنس کرائٹیر یا کے نام سے ایک سبق پڑھایا جاتا ہے۔اس سبق کا لب لباب یہ ہے کہ محقق اور ناظر کی اپنی ذات کا تعلق کس علاقے اور گروہ سے ہے، یہ بات اس کے مشاہدے کو لازمی متاثر کرتی ہے۔SRF کوریا میں لوگوں کو جاپان کو نمبرون کے نام سے پکارنے میں بھی عیاں ہے اور ذاتی طور پر مجھے بھی گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس مسئلے کا سامنا ہے کہ میں بھی ہر چیز کو پاکستان اور جاپان کے تناظر میں دیکھ رہا ہوں۔پاکستان میرا ملک اور جنم بھومی ہے اور جاپان میں قیام کو دو دہائیاں گزرنے کو ہیں،لہٰذا بات کسی بھی نگری، دیس کی ہو رہی ہو،ان دونوں کے اثرات جائزہ کا ضروری حصہ خود بخود بن جاتے ہیں۔

انسان جن بستیوں سے گزرتا ہے ،جن راستوں پر چلتا ہے، وہ انسان کی سوچ اور شخصیت پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔میری نظر میں مقامات انسانوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں اور انسان مقامات کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر ملک

اور تہذیب اس بات کی حق دار ہے کہ اس کا اسی کے مخصوص حالات میں انفرادیت کے ساتھ مشاہدہ اور تجزیہ کیا جائے۔مگر بشری کمزوریوں سے بھی مفر ممکن نہیں ہے۔اپنی نظر کے زاویے میں بیان کر چکا ہوں،جن کی بنیاد پر ہی غالباً مجھے کوریا کے سائن بورڈ،سڑکیں،پل،عمارتیں اور انفراسٹرکچر کے خدوخال سے لے کر رہن سہن کی چھوٹی چھوٹی ناقابل غور اشیاء تک حیرت انگیز حد تک جاپان سے مماثلت رکھتی یا پھر مشترکہ نظر آتی ہیں۔چہرہ مہرہ تو جاپان والوں سے ملتا جلتا ہے ہی، ملنے جلنے کے طور طریقے بھی شدید مماثل ہیں۔رکوع کی حالت میں ہی دونوں سلام کرتے ہیں۔البتہ کورین لوگوں کی نیم باز آنکھیں مجھے جاپانیوں کی نسبت قدرے زیادہ کھلی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔جاپانی تو بالکل بھی ہاتھ نہیں ملاتے البتہ کورین ہاتھ ملاتے بھی نظر آتے ہیں۔مقامی دوست لی البتہ بتا رہا تھا کہ کوریا میں بھی ہاتھ ملانا بدعت ہی خیال کیا جاتا ہے۔

اپنے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں کورین لوگ جاپانیوں کی نسبت زیادہ کھلے ڈھلے ہیں۔اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار یہ لوگ پاکستانیوں کی طرح باآسانی الفاظ کی صورت میں کر دیتے ہیں،جبکہ جاپانیوں کے باطن کو سمجھنا تو بے حد مشکل ہے۔کورین جلدی کھل جانے اور دوست بنا لینے کی صلاحیت رکھنے والے ہیں،اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار صاف اور واشگاف الفاظ میں کر دیتے ہیں، جاپانی تو اس بابت بعض اوقات قابل رحم دکھائی دیتے ہیں،ان پر ترس آنے لگتا ہے،کہ اتنی تکلیف میں ہیں،اور شدت جذبات کے باوجود اظہار اس طرح کر رہے ہیں جیسے انتہائی معمولی سی بات ہے۔ان کا اکثر اوقات الفاظ کا چناؤ شکایت اور مسترد کرنے کا ایسا ہوتا ہے کہ توصیف وتوثیق کا شک گزرنے لگتا ہے۔کوریا میں آ کر دیکھا کہ وہ اپنی اصل رائے بیان کرنے سے نہیں ٹھٹکتے چاہے وہ آپ سے یکسر مختلف ہی کیوں نہ ہو۔لوگوں کے تاثرات چہروں سے پڑھے جا سکتے ہیں۔یہ اقدار ہم پاکستانیوں سے مشترک ہیں۔جبکہ برطانیہ میں لوگ اپنے بچوں کو شروع سے گھروں میں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ہونے چاہئیں،یعنی ایسا منہ اور چہرے کے تاثرات کہ جسے بیک وقت جنازے اور شادی میں جانے کے لئے مناسب قرار دیا جا سکے۔

ایک لاکھ کلومیٹر کے مختصر سے جزیرہ نما پر سوا پانچ کروڑ نفوس پر مشتمل یہ قوم دنیا کی بارہویں بڑی معیشت کیسے بن گئی؟ جبکہ قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں، گیس، تیل، معدنیات سمیت قدرتی وسیلہ شمار ہونے والی کوئی دھات اس ملک سے نہیں نکلتی ہے۔ میری نظر میں اس خیرہ کن ترقی کی وجہ محنتی قوم اور موثر حکومتی نظام ہے۔ معاشی پالیسیوں کا تسلسل بھی ایک اہم وجہ ہے کہ یہاں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں مگر معاشی پالیسی ریاست کی مستقل خیال کی جاتی ہے۔ کرنسی یہاں وان کہلاتی ہے جو آجکل ایک روپے کے چھ آتے ہیں۔ اس تذکرے کا مقصد یہ باور کروانا ہے کہ کرنسی کا نرخ ملک کی معیشت اور اس کی ترقی کا رخ طے نہیں کیا کرتا۔

ساخالینی کورین

شمالی کوریا کی جانب سے جنگ کی ہر نئی دھمکی ملنے پر، سرحد پار جنوبی کوریا کے بہت سارے بڑے بوڑھے اب بھی پاؤں کے وزن پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیتے ہیں۔ زیادہ سمجھ دار لوگ حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ شمالی کوریا کو کوئی چاول کی کھیپ اور خوراک وغیرہ کا تحفہ بھجوایا جائے۔ باہمی بات چیت کے لئے کوئی نیا چینل بنانے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔ جنوبی کوریا میں بھی جاپان کی طرح تیس ہزار کے قریب امریکی فوج مستقل موجود رہتی ہے۔ ان دونوں میزبان ممالک کا امریکہ و مغرب سے اصرار مگر یہ ہے کہ تمام مسائل کو پرامن طریقے سے، بات چیت کے ذریعے سے ہی حل کیا جائے۔ جنوبی کوریا کے اس موقف کی وجہ کہ جنگ کسی بھی مسئلے کا حل پیش نہیں کر سکے گی، سرحد کے بالکل ساتھ ساتھ دونوں اطراف عوام آباد ہیں۔ سرحد کے انتہائی قریب آبادی ہونا بھی اتنی بڑی بات تو نہیں مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ ایک ہی قوم، ایک ہی نسل کے لوگ ہیں اور ایک ہی مذہب و عقیدہ کے ساتھ ساتھ مشترکہ تاریخی ورثہ رکھتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان بارڈر کے اردگرد بھی کافی جگہ پر گنجان آبادی ہے مگر زیادہ تر سرحد کے قریب قریب کھیت کھلیان ہیں یا بے آباد رقبہ ہے۔ اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو باؤنڈری کے دونوں طرف بیٹھے لوگوں کا شدید نقصان ہوگا، ماضی کی ہر جنگ کے موقع پر بھی یہی ہوتا ہے کہ تباہی کا پہلا شکار سرحد کے قریب آباد لوگ ہوتے ہیں۔ فقط سرحد کے ایک طرف کے لوگوں کو محفوظ بنانے کا تصور غیر منطقی اور ناقابل عمل ہے۔ سرحد کے بالکل قریب شمالی کوریا نے تو اپنی پہاڑیوں پر توپیں نصب کر رکھی ہیں جن

کا رخ جنوبی کوریا کی جانب ہے۔اب توپ کا گولا روکنے کی ٹیکنالوجی تو آج تک ایجاد ہی نہیں ہوئی ہے۔

میرے دوست کم آندرے کے آباؤاجداد کا تعلق شمالی کوریا سے ہے،وہ اکثر وہاں جاتا رہتا ہے۔حالانکہ وہ روس میں ہی پیدا ہوا اور اس کے بیوی بچے بھی روسی ہیں مگر اس کا دل کوریا میں ہی اٹکا ہوا ہے۔اس کے نزدیک شمالی کوریا کے حالات اتنے برے نہیں ہیں جیسے میڈیا دکھاتا ہے۔اس کے مطابق لوگ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔اس کے بقول تو وہاں جیسا لذیذ کھانا دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتا،غذائیت سے ایسا بھرپور کہ بوڑھوں کو جوان بنادے۔کوریا میں میرے میزبان دوست ساشا کی والدہ بھی شمالی کوریا کے ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔اس کے والدین روسی جزیرے ساخالین میں پیدا ہوئے تھے،وہیں پلے بڑھے اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔مجھے ابھی کم میخائل کا خیال آیا تو یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوریا میں میرے زیادہ تر جاننے والے ساخالینی کورین ہیں۔ساخالین کا تعارف دنیا بھر میں گیس کی سب سے بڑی فیلڈ، جو نہ صرف روس کا سب سے بڑا گیس ذخیرہ ہے بلکہ اس رنگ و بو کے تمام عالم میں پہلے نمبر پر ہے۔ساخالین جزیرے کے کورین نژاد باشندوں کی کہانی بہت ہی دردناک اور رلا دینے والی ہے۔بدقسمتی سے کئی لوگوں کی کہانیاں تاریخ فراموش کرتی آئی ہے،چونکہ یہ کسی بھی طاقتور ملک اور عصری قوت کے مفاد میں نہیں ہوتیں۔یہ دہرا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ مشرقی جزیرہ جس پر اب روس کی عملداری ہے،دوسری جنگ عظیم سے پہلے یہ جاپان کے قبضے میں تھا۔قدرتی وسائل اور معدنیات کی دولت سے مالا مال اس سرزمین کے وسائل بروئے کار لانے کے لئے افرادی قوت کی ضرورت تھی۔یہ تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ ان دنوں کوریا کے جزیرہ نما پر بھی جاپان کی عملداری تھی۔کوریا سے کچھ لوگوں کو روشن مستقبل کے جھوٹے پروپیگنڈے کی مدد سے اور کچھ کو زبردستی جاپانی سلطنت کا ن کنی کے لئے ساخالین لے کر آ گئی۔ان مزدوروں اور کان کنوں سے وعدہ تو یہ تھا کہ بس چند ہی روز آپ کا اس مشکل جزیرے پر قیام ہوگا مگر یہ وعدہ وفا نہ ہوا۔پہلے جاپانیوں نے

انہیں بغیر سفری دستاویزات اور سہولیات کے وہاں رکھا، اس کے بعد سوویت روس نے ان کو پاسپورٹ یا شناختی کارڈ سے تادیر محروم رکھا۔ یہاں تک کہ کئی نسلیں ان ساخالینی کورین نژاد باشندوں کی جنم لے کر، زندگی گزار کر چلی گئیں، اپنے ملک میں نہیں مگر ملک عدم۔

جاپانی شہنشاہت یا سوویت یونین کو کٹہرے میں کھڑا کرنا اس تحریر کا مقصد نہیں ہے، بلکہ مظلوم لوگوں کے اک ایسے گروہ کی کہانی بیان کرنا ہے جنہیں ان کی مرضی کے خلاف کوریا سے لاکر ساخالین کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ یہاں قید سے مراد جیل نہیں بلکہ جزیرے کی جلاوطنی ہے۔ یہ لوگ ثقافتی اعتبار سے روسی ہیں۔ یہ جو مخصوص لہجے میں کوریائی زبان بولتے ہیں اسے عرف عام میں یہاں ''کورومل'' کہتے ہیں۔ کوریا کے اندر اس لہجے میں کوریائی زبان کسی بھی علاقے میں ان دنوں نہیں بولی جاتی ہے۔ ایک ساخالینی کورین لڑکی بتا رہی تھی کہ میرے دادا کا کوریا سے رابطہ فقط ریڈیو کی نشریات تھیں، جن کی لہریں اوروویولینتھ کبھی کبھی ساخالین کے جزیرے پر بھی پکڑی جاتی تھی۔ وہ بتانے لگی کہ میرے دادا ایک رومال میں اپنے وطن کی مٹی پوٹلی بنا کر لائے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس ننھی سی پوٹلی کو کھولتے اور اس کی مٹی کو دیکھ کر خوب رویا کرتے تھے۔ اس خاتون نے تو خیر کورین لوگوں کی اس توہم پرستی کا بھی شکوہ کیا کہ اگر لڑکی بائیں ہاتھ سے کام لیتی ہے تو اس کی شادی نہیں ہوگی، مگر یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں جب جاپان شکست کے دھانے پر پہنچ گیا تو اس نے اپنی نوآبادیات سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساخالین سے انخلاء کے وقت جاپانی فوجیوں نے ان بے وطنوں سے ایک اور فریب کیا۔ ان غریب محنت کش کوریائی باشندوں سے کہا گیا کہ تم لوگوں کو واپس کوریا بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، تمہیں لینے کے لئے بحری جہاز آ رہے ہیں۔ تمام لوگوں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ مخصوص مقامات پر اپنا سامان باندھ کر جمع ہو جائیں۔ ان مقامات میں سب سے نمایاں ایک پہاڑی چوٹی تھی۔ یہ ایک جھوٹا وعدہ تھا، جس کے وفا ہونے کے انتظار میں تادیر لوگ بیٹھے رہے۔ کئی یہاں ہی مر کھپ گئے۔ اس پہاڑی پر اب ایک مینار نما یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ جاپان کے

انخلا کے بعد روسی فوجی آ پہنچے۔مزدوروں کی ضرورت تو ان کو بھی تھی ۔ماہر کان کن خصوصی طور پر درکار تھے۔اس لئے جاپان کی پالیسی سوویت یونین نے بھی جاری رکھی کہ کوئی بھی کورین یہ جزیرہ نہیں چھوڑ سکتا۔روس کے قبضے میں ساخالین آنے کے بعد بھی نصف صدی تک یہ بے چارے لوگ شہریت اور کسی بھی شناختی دستاویز سے نہ صرف محروم رہے، بلکہ کسی بھی حال میں اپنے دیس واپس جانے کے بنیادی انسانی حق سے بھی محروم ہی رہے۔پہلے جاپانی بولتے تھے،بعد میں روسی زبان بولنے لگے۔تاریخ کی کتابوں اور تذکروں میں آپ کو یہ کہانی شائد مشکل سے ہی ملے چونکہ روسیوں اور جاپانیوں دونوں کے لئے ہی یہ ہزیمت اور شرمندگی کا موجب ہے،اسی لئے اس کو چھپایا جاتا ہے،جیسے یہ کبھی تاریخ میں واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ساخالینی کورین اب دنیا بھر میں پھیل چکے ہیں،روسی زبان بولتے ہیں اور اپنی کورومل کورین بھی۔یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میرے زیادہ تر کورین دوست وہی ہیں جو روسی بولتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ شمالی اور جنوبی کوریا کے الحاق کے امکانات اور کوششوں کے حوالے سے تفصیلات بیان کروں۔پرانی نسل کے حوالے سے میرے کورین دوست لی کا خیال ہے کہ وہ الحاق کی شدید حامی اور اس بارے میں بڑی جذباتی رہی ہے،بزرگ نسل میں شدت سے پائی جانے والی یہ خواہش کہ کوریا دوبارہ متحد ہو جائے اپنی جگہ،نئی نسل کی سوچ مگر اس سے مختلف ہے۔جنوبی کوریا کی نسل نو یہ سمجھتی ہے کہ دونوں کوریا اگر دوبارہ متحد ہو جاتے ہیں تو اس سے ان کے لئے روزگار کے مواقع کم ہو جائیں گے، کیونکہ بہت ساری نوکریاں شمالی کوریا کے باشندے لے اڑیں گے۔معاشی تفاوت کے باعث وہ ہم سے کم تنخواہ پر بھی کام کرنے کے لئے باآسانی راضی ہو جائیں گے۔یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ شمالی کوریا کی آبادی دو کروڑ ساٹھ لاکھ کے قریب ہے۔میری نظر میں شمال کے بغیر کوریا مکمل ہی نہیں ہوتا۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا رقبہ جنوبی کوریا سے 20% زیادہ ہے اور دوسری وجہ اس کی زمینی سرحد چین اور روس دونوں سے ملتی ہے، جبکہ جنوبی کوریا جزیرہ نما ہے اور اس کی واحد زمینی سرحد شمالی کوریا کے ساتھ ہی ملتی ہے۔

قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین ملائیشیا

تم شکل سے بالکل پاکستانی لگتی ہو۔اگر بات نہ کرو تو ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ ملائیشین ہو۔لڑکی میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ایک چوتھائی پاکستانی ہوں۔میرے دادا کا تعلق پاکستان سے تھا،مگر میرے والدین اور میں ملائیشیا میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔برصغیر پاک و ہند سے ہجرت کر کے ملائیشیا بسنے والے ان لوگوں کا تناسب ساڑھے تین کروڑ کی ملکی آبادی میں سات فیصد ہے۔ملایا نسل جسے آپ مالے یا ملے (MALAY) بھی کہہ سکتے ہیں، یہاں کے قدیم النسل مقامی لوگ ہیں۔آبادی کا ستر فیصد انہی پر مشتمل ہے اور چینی النسل بیس فیصد آباد ہیں۔اہم بات مگر یہ ہے کہ یہی بیس فیصد چینی ہی آپ کو کاروبار اور معیشت کی ریڑھ کی ہڈی محسوس ہوتے ہیں۔اگر مارکیٹ پر ان کا مکمل قبضہ نہیں بھی ہے تو پھر بھی بڑے حصے کو یہی لوگ کنٹرول کرتے ہیں۔یہ ملک مقامی مالے،چینی اور برصغیر سے ہجرت کر کے آبادکاروں کے اجتماعی ثقافتی رنگ کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

تیرہ ریاستوں اور تین وفاق کے زیر انتظام علاقوں پر مشتمل ملائیشیا میں برطانوی ویسٹ منسٹر طرز کی پارلیمانی جمہوریت قائم ہے۔ملک میں آئینی طور پر بادشاہت رائج ہے۔آج کل بادشاہ عبداللہ تخت نشین ہیں،مگر تمام انتظامی امور عملی طور پر وزیراعظم ہی چلاتے ہیں۔وزارت عظمیٰ کا منصب آج کل انوار ابراہیم کے پاس ہے۔انوار ابراہیم کو سیاست میں متعارف کروانے والے مہاتیر محمد تھے۔بعد ازاں ان کے آپس میں اختلافات ہو گئے،نائب وزیراعظم کے عہدے سے

برخاست کردیئے جانے کے بعد جیل میں ڈال دیئے گئے۔ایک ایسا غیر اخلاقی مقدمہ ان پر قائم کیا گیا کہ مجھے ضبط تحریر میں لاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔مگر یہ سیاست بھی آسمانوں کا کھیل ہے۔آج کل وہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہیں اور مہاتیر محمد 95 سال کی عمر میں سیاست سے عملی طور پر ریٹائر ہو چکے ہیں۔یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ وزارت عظمیٰ سے دونوں مرتبہ مہاتیر محمد نے خود استعفیٰ دیا۔

مذہبی اعتبار سے یہ بڑا متنوع ملک ہے۔مسلمانوں کی ایک غالب اکثریت ہے اور ملک کی 63 فیصد آبادی اسلام کے ماننے والوں پر مشتمل ہے۔بدھ مت آبادی 20% فیصد اور عیسائی مذہب بھی بڑی تعداد میں موجود یعنی 10% آبادی کا عقیدہ ہے جبکہ ہندو مذہب بھی سات فیصد کے قریب لوگوں کا دھرم ہے۔کسی بھی کوچہ و بازار میں چلے جائیں آپ کو ماتھے پر بندیا، ٹیکا لگائے خواتین ضرور نظر آئیں گی، جو کہ ہندومت کی پیروکار ہیں۔ملکی سرحدیں تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کے علاوہ برونائی سے بھی ملتی ہیں۔سمندری سرحدیں فلپائن کے علاوہ سنگاپور سے ملتی ہیں۔مہاتیر محمد کی شدید خواہش تھی کہ سنگاپور اور ملائیشیا کے درمیان سمندر کے اوپر ایک پل تعمیر کیا جائے۔اس منصوبہ پر وہ ابتدائی کام بھی مکمل کر چکا تھا مگر ان کی حکومت کے خاتمے کے بعد اقتدار میں آنے والے لوگوں نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔انتقال اقتدار انسانی تاریخ کا مشکل ترین عمل رہا ہے۔جنگ و جدل اور خون خرابے اس عمل کا لازمی جزو رہے ہیں۔صوفی بزرگ حکمرانی اور اقتدار کو شیر کی سواری سے تشبیہ دیتے ہیں، شیر پر سوار ہونا آسان ہوتا ہے مگر اتر نا بہت ہی مشکل کام ہے۔اس باب میں مہاتیر محمد خوش قسمت آدمی ٹھہرے، دو دہائیاں مسلسل ملائیشیا کے حکمران رہے، جب انہوں نے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو وہ ٹی وی کیمروں کے سامنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ان کی بیٹی جو ساتھ کھڑی شاک اور بے یقینی کے عالم میں تھی، تیزی سے آگے بڑھی اور لڑکھڑاتے ہوئے مہاتیر محمد کو سہارا دیا تھا۔عمر کے 92 سال مکمل کر چکے تھے جب وہ دوبارہ حکمران بنے۔انسانی تاریخ کے معمر ترین حکمران بننے بلکہ منتخب ہونے کا انہوں نے اس مرتبہ اعزاز حاصل کیا، اور اس مرتبہ بھی

رضا کارانہ طور پر بڑے آبرومندانہ طریقے سے وزارت عظمیٰ سے مستعفیٰ ہوکر چلے گئے۔

ملائیشیا کی آبادی ہم سے سات گنا کم اور معیشت کا حجم ہم سے تقریباً دگنا ہے، عقل والوں کے لئے اس میں بہت ساری نشانیاں ہیں، ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس دیس کے پاس تو کوئی قدرتی وسائل بھی نہیں ہیں۔ پورا سال موسم ایک جیسا رہتا ہے۔ بارشوں کی کثرت کی وجہ سے زمین ہری بھری ہے۔ ملائیشیا کا نام سنتے ہی ذہن میں اب بھی پیٹروٹاور، اذلان شاہ ہاکی ٹورنامنٹ، پام کے ہرے بھرے باغات اور مہاتیر محمد کا نام ابھرتا ہے۔ اس شخص کو جدید ملائیشیا کا بانی اور مسیحا قرار دیا جائے تو یہ مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ میرا ذاتی مشاہدہ مگر اس بابت یہ ہے کہ کوئی بھی دیس چند حوالوں اور کچھ کتابوں میں سما جانے والی چیز نہیں ہے۔ جیتے جاگتے لوگ اور سرزمین ان گنت کہانیوں کی امین ہوا کرتے ہیں، ملک چاہے کوئی بھی ہو۔ عجز وانکساری یہاں کے لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی گفتگو اور انداز زندگی کا مشاہدہ کرکے یہ گمان کرنا بھی محال ہے کہ ان کو غصہ بھی آسکتا ہے۔ خوشی کی طرح رنج اور غصہ بھی ایک فطری جذبہ ہے، ممکن تو نہیں کہ سرے سے مزاج برہم ہی نہ ہوتا ہو، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نرم خوئی اور خوش گفتاری نمایاں معاشرتی پہلو محسوس ہوتا ہے۔

بنیادی خوراک اور مقبول عام غذا چاول کے ساتھ مچھلی ہے۔ پاک وہند سے آکر بس جانے والے سات فی صد لوگوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ سالن طرح طرح کے مل جاتے ہیں۔ بریانی بھی یہاں بہت مقبول ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مسلمان اکثریت کے باوصف اور انہی کے فیض سے تمام کھانے یہاں حلال ملتے ہیں۔ ہم جیسے تیکھے مصالحوں کی تاب تو یہ لوگ نہیں لاسکتے مگر پھر بھی بنیادی ذائقے اتنے اجنبی نہیں لگتے، ایک اپنائیت سی یہاں کے کھانوں میں محسوس ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ آٹا کھائے بغیر اگر تیسرا دن نمودار ہوجائے تو مجھے دنیا اندھیر نگری لگنے لگتی ہے اور روٹی کی عدم دستیابی حاتف غیبی کا اشارہ محسوس ہوتی ہے کہ کائنات کا خاتمہ قریب ہے، وقتِ آخر آہی گیا سمجھو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ملایا لفظ اور قوم کا مصدر ووجہ تسمیہ ہمالیہ یعنی کوہ ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ بتایا جاتا ہے۔ ملایا کے آخر میں ''یا'' یونانی اور لاطینی زبان میں رہنے کی جگہ اور وطن کے لئے استعمال

ہوتا ہے۔اس لاحقہ کو ملا کر پڑھیں تو ملایا س کا دیس ''ملائیشیا'' بن جاتا ہے۔قومی زبان مالے ہے اور کرنسی رنگٹ ہے۔آج کل ایک رنگٹ کی قدر و قیمت ساٹھ روپے کے برابر ہے۔مقامی لوگ جب آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو عموماً دو سوالوں کا تبادلہ لازمی ہوتا ہے،ایک یہ کہ کھانا کھالیا ہے؟اور دوسرا نماز پڑھ لی ہے؟

پاکستان میں بعض اوقات دانشور دوست عوام میں نسلی تنوع اور مذہبی تفاوت کا تذکرہ بڑے منفی انداز میں کرتے ہیں۔سندھی،پنجابی،پشتون،بلوچ،کشمیری و دیگر اقوام میں تو وہ تفاوت اور عداوت کی جھلک بھی نظر نہیں آتی جو کہ یہاں کے ملے،چینیوں اور ہندسندھ کا پس منظر رکھنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ہم پاکستانیوں کی مذکورہ بالا اکائیوں کا مذہب اسلام ہے،جبکہ یہاں ان قومیتیوں کے مذاہب تک مختلف ہیں۔مقامی لوگ زیادہ تر مسلمان ہیں،چینی زیادہ تر بدھ مت کے پیروکار اور ہندسندھ کے لوگ اکثریت میں ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں۔اس متنوع پس منظر کے باوجود پرامن طریقے سے مل جل کر ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔معاشی طور پر زبردست ترقی کر رہے ہیں۔اس وقت ملائیشیا دنیا کی تیسویں بڑی معیشت ہے۔غربت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔لوگوں کا عمومی معیار زندگی ہر آنے والے سال پہلے سے بہتر ہو رہا ہے۔بے روزگاری انتہائی کم ہے اور کام کرنے والے کے لئے تو روزگار کی ذرا بھی کمی نہیں ہے۔ہم ملائیشیا سے اس لئے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارا ہم مذہب اور ایشیا میں واقع ملک ہے۔

یہ دیس ہے میٹھے لوگوں کا

کوالالمپور ائیر پورٹ سے شہر کے مرکز میں پہنچنے تک ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ یہ آپ کی اپنی مرضی اور پسند ہے کہ ٹیکسی میں جائیں، بس کا سفر اختیار کریں یا پھر ٹرین کو ترجیح دیں، سبھی کچھ دستیاب ہے۔ میں نے ایئرپورٹ سے شہر کا فاصلہ ایک گھنٹہ بتایا جو کہ فنی اعتبار سے قابل اعتراض بات ہوسکتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جاپان میں طویل عرصہ سکونت اختیار کرنے کے سبب کچھ عادات واطوار اور ماحول کا اثر غالب آتا جارہا ہے، جاپان میں آپ کسی سے بھی فاصلہ پوچھیں تو وہ آپ کو منٹوں اور گھنٹوں میں بتائے گا۔ مثال کے طور پر کسی دفتر کا پتہ پوچھنے پر جواب ملے گا کہ پیدل دس منٹ اور کار پر تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ جیسے پاکستان میں اوبر اور کریم نامی ٹیکسی مقبول ہے، ویسے ہی ملائیشیا میں ''گریب'' کے نام سے موسوم ٹیکسی سروس سب سے اچھی اور سستی سروس فراہم کرتی ہے۔ آپ جہاں بھی کھڑے ہوں چند منٹ ہی انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی اور ''گریب'' آپ کے سامنے آجائے گی۔ طلوع آفتاب کا منظر تو کرۂ ارض کے ہر کونے میں خوبصورت ہوتا ہے مگر ملائیشیا کے سرسبز باغات اور اجلے آسمان میں تو یہ روح پرور نظارہ ہے۔ پنجاب کی دھند میں لپٹی سردی کے بعد گرم مرطوب موسم نے صبح کا مزہ دوآتشہ کر دیا۔

پاکستانیوں کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کا رویہ دوستانہ ہے۔ عجز وانکساری ویسے تو مشرق بعید کے تمام ممالک میں بسنے والے لوگوں کا خاصہ ہے مگر ملائیشیا میں اس انسانی صفت کا مقام انتہائی بلند پایہ ہے۔ یہ ان چند ممالک میں شامل ہے جہاں آپ کو آن لائن ویزہ ہی مل جاتا ہے۔ جس پر با آسانی ملک میں داخلے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ویزہ بھی بے حد آسانی سے دستیاب ہے، یہ بڑی سہولت کی بات ہے اسلام آباد جا کر ایمبیسی کے چکر نہیں لگانا پڑتے۔ ویسے میرے عازم سفر ہونے کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی

تھی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میٹھے بول میں جادو ہے۔اس ضرب المثل پر یقین آنے لگتا ہے جب انسان مشرق بعید میں سفر کے لئے نکلتا ہے۔جتنی زیادہ مادی ترقی نظر آتی ہے،لوگوں میں عاجزی وانکساری کے ساتھ اخلاق کی بلندی بھی اسی قدر عیاں ہوتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ ایشیاء کا یہ خطہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ خوش اخلاق لوگوں کا مسکن ہے۔

گرچہ مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے مگر بدھ مت،عیسائی اور ہندو بھی کافی بڑی تعداد میں آباد ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کو جا بجا مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں نظر آتی ہیں۔جس جگہ میرا قیام ہے،اس کے ساتھ ہی گنیش کا مندر ہے، جو کہ ملائیشیا ہیں قائم اہم مذہبی مقامات میں سے ایک ہے۔مندر کے اردگرد زیادہ تر عمارتیں، ہوٹل، دکانیں اور ریستوران ہندوستانی نژاد لوگوں کے ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس دیس میں مقیم بھارتی پس منظر کے حامل افراد کی غالب اکثریت کا تعلق جنوبی ہندوستان سے ہے۔ہجرت کر کے آئے ان لوگوں کی عمومی زبان ملیالم اور تامل ہے۔ مذہبی ہندو چونکہ سبزی خور ہوتے ہیں،اس لئے بے دھڑک ہوکر مندر سے ملحقہ ریستوران میں کھانا آڈر کیا تو پتہ چلا کہ بیروں میں ایک کمالیہ اور دو گجرات سے آئے ہوئے ہیں۔ہوٹل کا معاون استقبالیہ جہلم کا نوجوان ہے۔آج گردوارے گیا تو گیانی صاحب نے بتایا کہ کوالالمپور میں سات گردوارے ہیں اور پورے ملائیشیا میں ان کی تعداد 120 ہے۔سکھوں کی مجموعی آبادی یہاں تین لاکھ کے قریب ہے۔ جہاں میرا قیام ہے اس علاقے کو لٹل انڈیا کہتے ہیں۔قریب ہی چائنا ٹاؤن ہے۔جس کا پورا کلچر اور رنگ چینی ہے۔ ویسے تو مہاتیر محمد کے زمامِ اقتدار سنبھالنے سے پہلے پورے ملائیشیا کی معیشت پر ہی چینیوں کا غلبہ تھا مگر اب مقامی نسل کے مالے بھی کافی ترقی کر گئے ہیں،جن کا آبادی میں تناسب نصف سے بھی زیادہ ہے۔

چائنا ٹاؤن میں ایک چیز نے مجھے حیران کیا کہ یہاں چینیوں سے زیادہ مجھے اپنے ہم شکل پاکستانی اور انڈین چہرے نظر آئے۔ یہاں کے دوکانداروں کی واضح اکثریت مجھے دیسی لوگوں کی محسوس ہوئی۔ یہ میں آپ سے مرکزی بازار کا ذکر کر رہا ہوں، پورے علاقے میں ممکن ہے چینی ہی اکثریت میں ہوں۔چین میں نئے سال کی ابتداء عیسوی سال کے برعکس یکم جنوری کی بجائے فروری کے وسط کے آس پاس کہیں ہوتی ہے۔چین میں تو سال نو کی آمد کا اس قدر والہانہ استقبال کیا جاتا ہے کہ

پورا ایک مہینہ چھٹیاں منائی جاتی ہیں، بیرونی دنیا میں اس قدر شدت سے تو نہیں مگر جہاں جہاں چینی نژاد آباد ہیں، وہاں وہاں عالمی سطح پر اس کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ ملائیشیا میں تو نہ صرف بیس فیصد آبادی چینی نژاد ہے بلکہ معیشت میں ان کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔ اسی وجہ سے ان دنوں تمام بازاروں اور شاپنگ سنٹرز میں سرخ رنگ کے کاغذی گلوب سنہری جھالریں لٹکائے جا بجا نظر آتے ہیں، جن پر سنہری حروف سے چینی زبان میں غالباً نئے سال کے متعلق نیک جذبات اور خواہشات کا اظہار ہوتا ہے، کہیں کہیں ان کے اندر برقی قمقمے بھی جگ مگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ منظر صرف چائنا ٹاؤن کا ہی نہیں ہے، پورے کوالالمپور میں آپ کسی بھی شاپنگ مال میں چلے جائیں، حتیٰ کہ ٹوین ٹاور پیٹرو ناس بھی گیا تو وہاں پر بھی یہی منظر دیکھا۔ یاد رہے کہ پیٹرو ناس ٹوین ٹاور کو ایک طویل عرصے تک دنیا کی بلند ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ عمارتوں کے معاملے میں ایک خوبصورت بات ملائیشیا میں یہ دیکھی کہ قدیم و جدید کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ ایک عمارت پر 1919 لکھا ہے اور اس سے اگلی عمارت گزشتہ برس مکمل ہوئی جو کہ ستر منزلہ ہے پھر 1952 کی ایک خوبصورت فن تعمیر کا شاہکار عمارت، جس کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کے دنوں کی عمارت ایستادہ ہے اور اسے سے ملحقہ پانچ برس پہلے مکمل ہونے والا کثیر المنزلہ شاپنگ پلازہ ہے۔ مجھے تو یہ روایت اور جدت کا تعمیراتی حسین امتزاج بے حد بھایا ہے۔ چینی سال نو کا ذکر کر رہے تھے۔ جس کا ایک خوبصورت پہلو یہ ہے کہ ہر برس کا امتیازی نشان کوئی جانور ہوتا ہے، جیسے خوگوش، بکری، بھینس وغیرہ۔ اس سال 2024 کا امتیازی نشان ڈریگن ہے، جو کہ چین کا قومی نشان بھی ہے۔ ملائیشیا میں ان دنوں جس طرف بھی جائیں، جہاں بھی نظر دوڑائیں آپ کو کہیں نہ کہیں یہ سنہری ڈریگن ضرور نظر آجاتا ہے۔

ایک متاثر کن بات ملائیشیا کی حکومت اور عوام کی جانب فلسطین کی جدوجہد آزادی کے لئے زبردست حمایت ہے۔ اس کا ایک پہلو تو کوچہ و بازار میں جگہ جگہ لہراتے فلسطینی پرچم ہیں، دوسرا پہلو مگر اس سے بھی اہم ہے اور وہ قومی میڈیا میں تمام اینکرز اور نیوز ریڈرز کا کوفیہ پہن

کرخبریں پڑھنا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ کوفیہ وہ مخصوص سیاہ وسفید رومال ہے جو یاسر عرفات سے لے کر لیلیٰ خالد اور دیگر فلسطینی حریت پسند رہنماؤں اور کارکنوں کے گلے میں آپ کو نظر آتا ہے۔ سفید رنگ کے کپڑے پر سیاہ دھاگے سے کشیدہ کاری کر کے دھاریوں اور نقطوں پر مبنی اس مخصوص رومال اور گلوبند کی ابتداء چونکہ عراق کے شہر کوفہ سے ہوئی تھی، اس لئے اس نسبت سے اسے کوفیہ کہا جاتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کوفیہ فلسطینیوں کی مزاحمتی تحریک کا نشان بن کر ابھرا ہے اور آزادی کی علامت گردانا جاتا ہے۔ یہاں کی ٹیلی ویژن نشریات میں اینکر حضرات نے جو کوفیہ گلے میں پہنا ہوتا ہے، اس کے ایک کونے کی طرف قبلہ اول بیت المقدس کی تصویر ہوتی ہے، جس پر ''القدس لنا'' تحریر ہوتا ہے، جبکہ دوسرے کونے پر ملائیشیا کا پرچم دکھائی دیتا ہے، جو کہ نہ جانے کیوں مجھے ہمیشہ امریکی پرچم کی یاد دلا دیتا ہے۔ گزشتہ روز لوگوں سے کھچا کھچ بھرے اسٹیڈیم میں وزیراعظم انوار ابراہیم خطاب کر رہے تھے۔ جناب وزیراعظم کی تقریر کا مفہوم تو میں نہیں سمجھ سکا چونکہ یہ مقامی زبان مالے میں تھی، مگر میرا خیال ہے کہ یہ فلسطینیوں کے حق میں تھی، کیونکہ پورے میدان میں جوش وجذبے سے بھرے ہوئے عوام فلسطینی پرچم لہرا رہے تھے، جبکہ وزیراعظم انوار ابراہیم نے اپنے گلے میں یہی مخصوص رومال ''کوفیہ'' پہن رکھا تھا۔

ملائیشیا نامہ

قرون وسطیٰ کے یورپ میں بڑے بحری بیڑوں میں جدت اور یورپی اقوام کے توسیع پسندانہ عزائم کے لئے ان بحری جہازوں کا استعمال ،دنیا کے باقی خطوں کے لئے بہت بری خبر ثابت ہوئی۔مقامی اقوام سے آزادی اور خودمختاری چھین لی گئی،ان کے قدرتی وسائل پر قبضہ جما کر،لوٹ مار کر کے یورپ لے جایا جانے لگا۔برسبیل تذکرہ انگریزی زبان کا لفظ ''لوٹ'' انہی دنوں اردو ہندی سے انگریزی لغت کا حصہ بنا جب نوآبادیاتی نظام نے برصغیر میں اپنے پنجے گاڑ کر لوٹ مار شروع کر دی تھی۔صدیوں تک جاری رہنے والے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ عمل میں اٹھارویں صدی کے دوران ملائیشیا برطانوی اور ولندیزی قبضے میں چلا گیا۔اس سے قبل وہاں مالے بادشاہتیں قائم تھیں۔غلامی کا یہ دور 1957 تک جاری رہا،اس کے چھ سال بعد ملایا اور تاج برطانیہ کے زیر نگیں شمالی بورینو،ساراواک اور سنگاپور نے مل کر جدید ملائیشیا کو تشکیل دیا۔یہ الگ قصہ ہے کہ 1965 میں سنگاپور کو اس فیڈریشن سے زبردستی الگ کر دیا گیا تھا۔خوبصورت بات یہ ہے کہ آزادی کے ابتدائی سال جدوجہد کے رہے مگر اس کے بعد مسلسل پچاس برس تک معیشت کی شرح نمو 6.5 سے کبھی بھی کم نہیں ہوئی ،سیاسی اتار چڑھاؤ بھلے جیسے بھی آئے ہوں۔سیاست کی بات کریں تو یہاں برطانوی طرز کا پارلیمانی جمہوری نظام رائج ہے البتہ ریاست کا سربراہ وزیراعظم نہیں بلکہ منتخب بادشاہ ہوتا ہے۔منتخب یوں کہ نو ریاستوں کے بادشاہ ایک شہنشاہ چن لیتے ہیں۔ریاستوں کی کل تعداد تیرہ ہے، جنہیں آپ صوبے کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔وفاق کے

زیرانتظام تین علاقے ان کے علاوہ ہیں۔

ساڑھے تین کروڑ کی آبادی میں گرچہ سنی مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے مگر بیس فیصد بدھ مت اور سات فیصد ہندو آبادی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، دس فیصد عیسائی آبادی بھی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معیشت کی بھاگ دوڑ انہی مذہبی اقلیتوں کے ہاتھوں میں نظر آتی ہے۔ یہ مذہبی رنگارنگی اور تقسیم کسی حد تک نسلی پس منظر سے بھی جڑی ہوئی ہے، جو کسی قوس قزح کے رنگوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ ملک کی آدھی آبادی مالے نسل سے تعلق رکھتی ہے، جو تقریباً تمام مسلمان ہیں، یاد رہے کہ مالے بھی یہاں کی مقامی نسل نہیں ہیں۔ مگر وہ صدیوں کے ارتقاء کے دوران مقامیوں کے ساتھ گھل مل گئے ہیں اور دونوں گروہ ایک ہی مذہب اسلام کے پیروکار ہیں۔ بھارتی نسل سے تعلق رکھنے والے جنوبی ہند سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ تامل اور ملیالم زبان زیادہ بولتے ہیں اور ہندو عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ کیلے کے پتوں پر سفید ابلے ہوئے چاول ڈالے گئے، پھر ایک صاحب بالٹی میں دال لئے چاولوں پر ایسے پروس رہے تھے۔ جیسے غسل کے وقت نہانے کے لئے ہم ''پوا'' استعمال کرتے ہوئے بالٹی سے بھر کر بدن پر ڈالتے ہیں۔ ہاتھ کی انگلیوں کی مدد سے کھانے، یعنی دال اور چاولوں کو مکس کر کے کھایا گیا۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ جھجکتے ہوئے کھانا شروع کیا تو وہ انتہائی لذیذ تھا۔ میرے ہندو دوست کا اس بابت فرمان تھا کہ پرساد ہمیشہ مزیدار ہوتا ہے۔ ریستوران کا مالک کیرالہ سے آیا ہوا ہے۔ اس مذہبی اور ثقافتی رنگارنگی کا ایک حسین پہلو یہ ہے کہ یہاں پر سارا سال ہی کوئی نہ کوئی تہوار منایا جارہا ہوتا ہے۔ گویا پنجابی مثال کے مصداق ''ست دن تے اٹھ میلے، گھر جاواں کیہڑے ویلے'' کا منظر نظر آتا ہے۔

یورپ سے بہت زیادہ سیاح یہاں آتے ہیں۔ بالخصوص امریکہ اور برطانیہ سے آنے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انگریزی زبان سمجھنے والوں کی تعداد یہاں پر کافی بڑی ہے۔ اگرچہ سرکاری زبان ملائیشین مالے ہے، جو بنیادی طور پر مالے ہی کی ایک معیاری شکل ہے، مگر نوآبادیاتی پس منظر کے سبب انگریزی یہاں کی دوسری بڑی زبان ہے

اور بہت ہی عام فہم ہے۔ان دنوں روسی نژاد سیاحوں کی بھی بہتات ہے، جس کا سبب روس، یوکرین جنگ بھی ہوسکتا ہے، چونکہ دونوں ملکوں میں فوجی نوکری لازمی ہے، اوران دنوں زبردستی بھرتی کئے جانے کی خبریں دونوں ملکوں سے ہی آرہی ہیں،اس لئے بہت سے نوجوان فوجی بھرتی سے بچاؤ کے لئے بھی یہاں پناہ گزین ہیں۔ پرکشش سیاحتی مقام کا درجہ پانے کی سب سے اہم وجہ میری نظر میں امن وامان کی مثالی صورت حال ہے۔آپ آدھی رات کو گلیوں، بازاروں میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ چوری، چکاری، چھینا جھپٹی نہ ہونے کے برابر ہے۔گردوپیش کی فضا میں ایک تحفظ اور نرمی کا احساس سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ہم بھی اگر چاہتے ہیں کہ پاکستان میں سیاحت فروغ پائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسی فضا قائم کی جائے جس میں سیاح خود کو محفوظ محسوس کریں۔

ملائیشیا اپنے ثقافتی ورثے کی طرح جغرافیائی طور پر بھی بڑا متنوع ہے۔یہ ایک جزیرہ نما ہے۔زمینی سرحد فقط تھائی لینڈ سے ملتی ہے۔ویسے تو سنگاپور بھی اب ایک پل کے ذریعے ملائیشیا سے جڑ گیا ہے لیکن عملی طور پر اسے ہمیشہ سے ہی ملائیشیا کا حصہ تصور کیا جاتا ہے،کوئی الگ تھلگ ملک نہیں۔آبی سرحد انڈونیشیا کے علاوہ کئی ممالک سے ملتی ہے۔جزیروں کے جھرمٹ میں کئی جگہ تو ملائیشیا اور انڈونیشیا بہت ہی قریب پائے جاتے ہیں۔معیاری وقت پاکستان سے تین گھنٹے آگے ہے اور ساٹھ کا ہندسہ اس ملک کا امتیازی نشان شمار ہوتا ہے، جو کہ ٹیلی فون کا عالمی طور پر ملائیشیا کے لئے کالنگ کوڈ ہے۔تہذیب وثقافت سے لگاؤ اور جدت پسندی کا ایسا حسین امتزاج دنیا کے کسی اور ملک میں کم ہی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

سرخ پتیوں اور پیلے ڈانڈے والا ''ہائی بسکس'' ملائیشیا کا قومی پھول ہے۔اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ کوالالمپور شہر کا ذکر اس گل خوش رنگ کے بغیر ادھورا ہے۔اس نگر میں آپ جہاں کہیں بھی چلے جائیں یہ پانچ پتیوں والا ہائی بسکس آپ کو ہر جگہ نظر آجائے گا۔اس نازک پیکر پھول کو ''گلِ وطن'' کا درجہ دینے کی وجہ ایک سیانے نے ہمیں یہ بتائی کہ اس کی پانچ پتیوں سے اس ملک کی پانچ نکاتی حکمت عملی کا اظہار ہوتا ہے۔وہ پانچ عزائم یہ ہیں کہ اول خدا پر بھروسہ، دوم بادشاہ

اورمملکت سے وفاداری،سوئم آئین اورقانون کی عملداری،چہارم و پنجم دانشمندانہ رویہ اور بلند کردار گردانے جاتے ہیں۔پھول کا سرخ رنگ ہمت اور حوصلے کی علامت مانا جاتا ہے۔جس طرح چیری کے پھول کو جاپان کی روح قرار دیا جاتا ہے،بالکل اسی طرح ہائی بسکس کو ملائیشیا کی روح قرار دیا جائے تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔

حصہ دوم

نیرنگِ خیال

زبانِ یار کے اوجِ کمال کا نسخہ

امریکی خلانوردوں کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ روسی زبان سیکھیں۔اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے میں نے ناسا میں کام کرنے والے اپنے دوست سے اس امر کی وجہ دریافت کی ،اس نے دو وجوہات بیان کردیں۔پہلی وجہ تو یہ ہے کہ خلا میں قائم اسٹیشنوں پر مقیم روسی خلابازوں کی تعداد کا تناسب بہت زیادہ ہے۔اگر ہم سب سے زیادہ بھی کہہ لیں تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی، بلکہ یہی حقیقت ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ روسی لوگ انگریزی سمیت کسی بھی غیر ملکی زبان کو سیکھنے کی زحمت عمومی طور پر گوارا نہیں کرتے ہیں۔اس صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ،امریکی خلابازی ادارہ ناسا،اپنے زیرتربیت خلابازوں کو خلائی شٹل میں سوار کروانے سے پہلے روسی زبان کا کورس مکمل کرواتا ہے۔تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت حال میں روسی خلابازوں کے ساتھ مکمل مکالمہ ممکن ہوسکے۔مجھے یہ جان کر اس لئے خصوصی خوشی ہوئی کہ خلا کے سفر پر جانے کے لئے کم ازکم ایک شرط تو میں نے پوری کررکھی ہے۔

پاکستان میں اکثر اردو زبان کو قومی سطح پر بزورطاقت مکمل رائج کرنے کی باتیں کانوں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔اسی طرح ہمارے بہت سارے دانشور اور اہلِ قلم دوست دیگر علاقائی زبانوں کی ترویج اور ان کے فروغ کے لئے سرکاری اقدامات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔سچی بات تو یہ ہے مجھے ذاتی طور پر اردو زبان سمیت پاکستان کی تمام زبانوں سے محبت ہے اور میں انہیں سیکھنے کا ہمیشہ خواہش مند بھی رہا ہوں،اس دنیا کے مگر کچھ تلخ حقائق ہیں۔زبان ہمیشہ ضرورت کے تحت،عموماً مجبوری کے عالم

میں ہی سیکھی جاتی ہے، چاہے وہ آپ کی مادری زبان ہی کیوں نہ ہو۔ایک سادہ سا سوال ہے کہ پوری دنیا میں انگریزی کی مقبولیت ہر آنے والے سال اور دہائی میں کیوں بڑھتی جارہی ہے؟ حالانکہ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی انگریز کی عالمی حکمرانی اور اقتدار کا سورج تو تقریباً غروب ہو چکا ہے۔اب تو برطانیہ کا عالمی سطح پر اثر ونفوذ نہ صرف کم ہورہا ہے بلکہ اس کا دائرہ اثر بھی سکڑتا چلا جارہا ہے۔پھر کیا وجہ ہے کہ انگریزی زبان بام عروج پر ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں کاروبار کرنے کے لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے۔اس عالم رنگ وبو کی سب سے بڑی معیشت امریکہ اور دس بڑی معیشتوں میں شامل برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں چونکہ انگریزی بولی جاتی ہے، اس لئے ان ممالک سے کاروبار کرنے کے لئے یہ زبان دنیا کے دیگر خطوں کے بسنے والوں کو بھی مجبور کردیتی ہے کہ رابطے بہتر بنانے کے لئے یہ زبان سیکھ لیں۔

اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کا المیہ یہ ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبانیں نہیں ہیں۔ان زبانوں میں متذکرہ مضامین وموضوعات کے بارے میں جو تحریریں بھی ملتی ہیں وہ تمام عموماً کسی اور زبان سے ترجمہ شدہ ہوتی ہیں۔اردو سائنس بورڈ اور مقتدرہ قومی زبان کی کوششیں اپنی جگہ قابل تعریف ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ ہم کوئی بھی چیز ایجاد نہیں کررہے اور نہ ہی ہماری تحقیق اس قابل ہے کہ دنیا اس کو درخورِ اعتنا سمجھے۔باقی مقتدرہ قومی زبان کا نام تبدیل کرکے ادارہ فروغ اردو کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہم خوبصورت نام تجویز کرنے اور پھر رکھے گئے ناموں کو تبدیل کرنے پر ہی اپنی تمام تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔اگر شعر وسخن کی بنیاد پر زبانوں کی مقبولیت اور قبولیت کا تعین ہوسکتا تو پھر معذرت کے ساتھ فارسی ادب ہم سے بہت آگے ہے۔اردو سمیت پاکستان کی کسی بھی مقامی زبان میں اس قدر ادبی سرمایہ موجود نہیں جتنا فارسی زبان کے دامن میں ہے، مگر آپ جانتے ہیں کہ عالمی تناظر میں اس زبان کا حال بھی ہمارے جیسا ہی ہے۔اس کی وجہ مشترک ہے کہ فارسی میں بھی ہماری زبان کی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کے متعلق ایجادات نہیں ہورہی ہیں اور نہ ہی بین الاقوامی سطح پر یہ کاروباری زبان ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ مغلوب قوم کی ثقافت ونظریہ کبھی بھی نہیں پھیلتا، بلکہ وہ بھی مغلوب ہی رہتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ البیرونی کا یہ قول بھی اس بابت قابل توجہ ہے کہ تمام دنیا کے غلاموں میں یہ عادت مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ آقاؤں کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اب نقل کے معاملے میں بھی آقاؤں کی ہر چیز تک رسائی ممکن نہیں ہوتی،یعنی آقا کی عقل اور سوچنے کے انداز کو تو شائد نقل کرنا مشکل ہوتا ہے،لہٰذا وہ آسان چیزوں کی نقل کرتے ہیں،یعنی آقا کا لباس،زبان،نشست وبرخاست،چال ڈھال وغیرہ۔آج تو ہم غلام نہیں ہیں،آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔اس میں بھی مگر کیا شک ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی زبان کا وجود ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔تلخ بات مگر یہ ہے کہ ہماری زبان میں ایجاد کیا ہو رہا ہے،جس کی وجہ سے دنیا کو اس کی ضرورت محسوس ہونے لگے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بابت کوئی ایک دریافت،کوئی ایک چیز ایجاد بھی تو یہاں نہیں ہو رہی، پھر کیسے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری زبانیں ترقی کر جائیں گی؟اردو زبان کے قیام اور عرج کی وجہ بھی یہ تھی کہ برصغیر پاک وہند میں لوگوں کے باہمی رابطے کی کوئی اس سے بہتر زبان موجود نہیں تھی۔بازار میں کاروبار وتجارت کی ضرورت نے اس زبان کو فروغ دیا جو کہ چھاؤنیوں میں رہنے والے مختلف علاقوں کے فوجیوں کی آپسی رابطے کی زبان کے طور پر وجود میں آئی تھی۔

زبان کی ایجاد کا جو بنیادی نظریہ تھا،آدمؑ سے لے کر آج تک وہ تبدیل نہیں ہوا ہے،جو کہ فقط اتنا ہے کہ اپنی بات دوسرے لوگوں تک پہنچائی جا سکے اور دوسرے لوگوں کا مافی الضمیر سمجھا جا سکے۔ذاتی طور پر میں ہفت زبان ہوں۔اس عرض گزارنے کا مقصد فقط یہ کہ میں کسی بھی زبان کو برتر یا کم تر نہیں سمجھتا۔زبان کوئی بھی ہو فقط ذریعہ اظہار ہے،نہ اس سے زیادہ کوئی چیز ہے اور نہ ہی اس سے کم ہے۔حالانکہ قوت گویائی اور سماعت سے محروم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شائد مکالمے کے لئے الفاظ اور گفتگو بھی اضافی چیزیں ہیں۔زبان کی بابت میرا نقطہ نظر عمومی اور مقبول عام اعتقادات ونظریات سے ذرا مختلف ہے۔میری نظر میں زبان کسی بھی ثقافت اور سماج

کاDNA ہوتی ہے،ثقافتی رگوں میں گردش کرنے والاخون کہنا بھی بے جانہ ہوگا۔جب تک آپ کسی خطے کی مقامی زبان نہیں سمجھتے،معذرت کے ساتھ، آپ اس سماج اورثقافت کوبھی سمجھنے کادعویٰ نہیں کرسکتے۔زبان کوجانے سمجھے بغیرسماج کوسمجھنے کادعویٰ باطل ہے۔

حیرت اس وقت ہوتی ہے جب لوگ زبان کی بنیاد پرتعصّبات کی باتیں کرتے ہیں اوران تعصّبات پرسیاست کرتے ہیں۔پاکستان لسانی اعتبارسے بہت ہی متنوع ملک ہے۔اس کرۂ ارض پرچندہی ایسے ممالک ہوں گے جن میں اتنی زیادہ تعدادمیں زبانیں مقامی طور پر بولی جاتی ہیں۔اگرہم مثبت اندازفکراپنائیں تویہ ایک بہترین موقع ہے کہ ہم ذراسی کوشش سے،سرمایہ خرچ کئے بغیر،کئی زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔ہمارے اردگردرہنے والے لوگ ہی کوئی نہ کوئی ایسی زبان بول رہے ہوتے ہیں جوہماری مادری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔یہ ایک بہترین موقع ہے اورہمیں مفت دستیاب ہے۔بس ذراسی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔باقی جہاں تک پاکستانی زبانوں کی ترقی کاتعلق ہے،تواس بارے میں تلخ حقیت یہ ہے کہ ہماری زبانیں اسی وقت ترقی کریں گی جب ہم بحیثیت پاکستانی قوم ترقی یافتہ ہوجائیں گے۔انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ زبانوں کاعروج وزوال بھی قوموں کےعروج وزوال کے ساتھ جڑاہواہے۔جب ملک وقوم عروج پاتے ہیں توان کی زبان بھی اوج کمال پرپہنچ جاتی ہے۔

بین الثقافتی ہم آہنگی کی عالمی ضرورت

گزشتہ ماہ کینیڈا میں ایک پاکستانی نژاد خاندان کے ساتھ پیش آنے والے دہشتگردی کے واقعے نے تمام دنیا کے اہلِ دل اور حساس لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بلا مبالغہ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے ،جس میں ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کے چار افراد کو ایک سفید فام نسل پرست نوجوان نے تیز رفتار ٹرک کے نیچے دانستہ طور پر کچل دیا۔ صورتحال اس لئے زیادہ پریشان کن ہے چونکہ اب تک سامنے آنے والی تفصیلات کے مطابق متاثرہ خاندان سے قاتل کی کوئی جان پہچان یا ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ مبصرین کی غالب اکثریت نے اس افسوس ناک واقعے کو مغرب میں بڑھتے ہوئے اسلاموفوبیا سے جوڑا ہے، تجزیہ نگاروں کی یہ رائے بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ مغربی میڈیا اور حکومتیں بڑی دیر تک اسلاموفوبیا کو جھٹلاتی رہی ہیں۔ کینیڈا کے وزیراعظم جسٹن ٹروڈو نے جب اس واقعے کے اسلاموفوبیا کے ساتھ نام لے کر منسلک کیا تو غالباً یہ پہلا موقع تھا جب کسی اہم مغربی سربراہ حکومت نے اعتراف کیا ہو کہ ان کے معاشرے میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

اگرچہ مغربی دنیا میں ''Clash of Civilizations'' کی طرز پر بہت ساری کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں، جن میں مغربی مصنفین نے سوویت یونین کے انہدام اور کیمونزم کے زوال کے بعد اسلام کو مغربی طرز زندگی اور تہذیب کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور چیلنج قرار دیا ہے ،مگر کبھی بھی وہاں کے مین سٹریم میڈیا نے اس موضوع کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ ملائیشیا کے سابق صدر ڈاکٹر مہاتیر محمد اس مسئلے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے میں بڑا اہم

کردار ادا کر چکے ہیں۔اہم سوال مگر یہ ہے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ میری نظر میں تو پرامن طور پر آگے بڑھنے کا واحد راستہ بین الثقافتی ہم آہنگی ہے۔

زیادہ افسوسناک پہلو مذکورہ واقعے کا یہ ہے کہ یہ رونما ہونے والا پہلا واقعہ نہیں ہے، اور بدقسمتی سے نہ ہی اپنی نوعیت کا یہ آخری واقعہ ثابت ہوگا، جس کی بنیاد نسلی تعصب، مذہبی منافرت اور عدم برداشت کا رویہ ہے۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل میں اس طرح کے حادثے رونما نہ ہوں کہ جس میں نوجوان یہودی سفید فام نے اپنے سے مختلف نظر آنے والے انسانوں کو ٹرک کے ٹائروں کے نیچے یوں کچل دیا جیسے کوئی صاحب دل کسی جانور کو بھی کچلنے کا تصور نہیں کرسکتا۔اس مسئلے کے حل کے لئے ہماری دنیا کو باہمی ثقافتی مکالمے کی طرف بڑھنا ہوگا۔یہ کوئی خیالی یا فقط علمی گفتگو نہیں ہے بلکہ ایک عملی چیلنج ہے، جس سے اگر مناسب انداز میں نہ نمٹا گیا تو مستقبل میں اس کی شدت مزید بڑھ جانے کا خدشہ ہے۔اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ یہ ایک بحث طلب موضوع ہے، جس کی کئی جہتیں ہیں۔

پہلے ہم ثقافت پر ہی بات کر لیتے ہیں۔ثقافت ہے کیا چیز؟ کثرت استعمال سے گرچہ یہ لفظ بہت بدنام اور پامال ہو چکا ہے مگر پھر بھی اس کی اہمیت سے مفر ممکن نہیں ہے۔مختصر اور سادہ ترین الفاظ میں ''کسی بھی خطے کے لوگوں کا زندگی گزارنے کا مخصوص ڈھنگ ثقافت کہلاتا ہے'' اس دنیا کا علاقہ چاہے کوئی بھی ہو، اس خطۂ ارض کے لوگوں کی بود و باش اور انداز زیست اگر ثقافت، کلچر یا فرہنگ کہلاتی ہے تو میری نظر میں زبان کسی بھی کلچر کا DNA ہوتی ہے۔کسی بھی کلچر کو سمجھنے کے لئے اس کی زبان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ثقافت کی مثال اگر جسم کی طرح ہے تو زبان اس جسم میں روح کی مانند ہے۔آج جب تہذیبوں کے ٹکراؤ جیسے موضوعات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ممکنہ ٹکراؤ کو روکنے کی پیش بندی کی جائے۔اس ضمن میں بین الثقافتی ہم آہنگی پیدا کر کے ہم ایک بہتر مستقبل کی جانب بنی نوع انسان کے لے کر جا سکتے ہیں۔

میری اس موضوع سے نسبت کا مختصر احوال یوں ہے کہ درجنوں ممالک کی میں نے سیاحت

کی ہے اور سات عالمی زبانوں پر مجھے دسترس حاصل ہے۔ گرچہ روایتی تعلیم بائیو کیمسٹری اور ایم بی اے مگر میرا شوق شعر و ادب رہا ہے۔ اب تک میری ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے ایک نوبل انعام یافتہ شعراء پابلو نرودا اور گبریلا مسترال کی شاعری کے ہسپانوی زبان سے براہ راست اردو زبان میں منظوم تراجم پر مشتمل ہے۔ آج کل میں جاپان کے صوفی شاعر ماتسو باشو کا جاپانی سے پنجابی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ شاید اسی پس منظر کے سبب گزشتہ دنوں گورنمنٹ کالج وومن یونیورسٹی فیصل آباد نے مجھے بین الثقافتی ہم آہنگی میں تراجم کے کردار پر لیکچر دینے کی دعوت دی۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلباء کے علاوہ شعبہ اردو کے اساتذہ اور صدر نشین ڈاکٹر صدف نقوی بھی سامعین میں موجود تھیں۔ موضوع سخن ایسا ہے کہ درس گاہوں سے باہر عمومی اخباری قارئین کے لئے بھی دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے۔

یہ آج کی تلخ حقیقت ہے کہ دنیا تنگ نظری کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے، جو کہ زمین کو تنگ کئے جا رہی ہے۔ جب ہم ایک زبان کے ادب کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرتے ہیں تو ہمیں دوسرے لوگوں کے انداز فکر، نظریات کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیمانوں کی بھی سمجھ آتی ہے۔ نفرت اور محبت کے اظہاریے معلوم پڑتے ہیں۔ کسی بھی زبان کا ادب اس کے سماجی، ثقافتی اور عقلی ارتقاء کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اگر ہم عالمی امن کے خواہاں ہیں تو اس کے لئے ثقافتی ہم آہنگی ضروری ہے۔ مکالمہ اس ضمن میں سب سے موثر اور بنیادی عنصر ہے، جس کا ایک طریقہ بین اللسانی تراجم ہیں، جو کہ ایک دوسرے کی ثقافت کو سمجھنے میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں، ہمارے ہاں بہت سے دانشوروں کے نزدیک ثقافت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ ہمارے باباجی اشفاق احمد کہ جن سے میری نیاز مندی تھی، کہتے تھے کہ میں نے سویٹر پہنا ہوا ہے، کیونکہ مجھے سردی لگ رہی ہے، اس میں سے ثقافت کہاں سے آ گئی؟ نسیم حجازی نے تو ثقافت کی مذمت میں پورا ناول لکھ چھوڑا ہے، ''ثقافت کی تلاش''۔ ہمارے لبرل اور ترقی پسند دوست مگر دوسری انتہا پر کھڑے ہیں، کہ مذہب کا ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز ثقافت اسلامیہ نام کی کسی چیز کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

بیرونی دنیا میں اپنی اپنی ثقافت سے بہت زیادہ لگاؤ پایا جاتا ہے۔ عمومی طور پر لوگ اسے نہایت اہم خیال کرتے ہیں۔ اس بابت میں لاطینی امریکہ کے دو واقعات بیان کرنا چاہوں گا۔ میلے ٹھیلے ہماری طرح

تقریباً پوری دنیا میں ہوتے ہیں۔ایسے ہی ایک میلے میں چلی کے دور دراز شہر میں شرکت کا موقعہ ملا۔بہت سال پہلے کی بات ہے،ان دنوں یہ سمارٹ فون والے کیمروں کا رواج اور راج نہیں تھا۔مووی کیمرے اچھے خاصے بڑے سائز کے ہوا کرتے تھے۔اور پوری دنیا میں ان کی بڑی عزت وقدر تھی۔لوگ ان کا بڑا احترام اور تکریم کرتے تھے۔وہاں میرے اردگرد فلم میں نظر آنے کے شوق میں بہت سارے بچے اکٹھے ہو گئے،وہاں انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔وہ نعرے اب بھی مجھے یاد ہیں،ہسپانوی زبان میں سب سے نمایاں نعرہ

''VIVA LA CULTURA''

یعنی ثقافت زندہ باد تھا۔آپ جیوے جیوے کلچر جیوے بھی کہہ سکتے ہیں۔

سلفی عقیدے کے حامی ہمارے دوست خالد صاحب مذہبی رجحان رکھتے ہیں۔جہاد میں عملی طور پر بارہا شریک ہوئے۔گرچہ کئی ممالک میں پرخطر حالات میں بھی جہاد کا اسلامی فریضہ سرانجام دیا،مگر ساتھ ساتھ ہماری طرح تجارت بھی کرتے ہیں۔ایک مرتبہ جنوبی امریکہ میں ان کو نئی سیکرٹری کی ضرورت پڑی تو انہوں نے بذریعہ اشتہار یا جو بھی مروجہ طریقہ کار تھا اعلان کروایا۔ڈھنڈیا پڑی تو ایک خوبرو خاتون نوکری کے لئے انٹرویو دینے آ گئی۔لڑکی ذہین تھی اور سیکرٹری کا مطلوبہ کام بھی جانتی تھی۔مقامی رواج کے مطابق اس نے منی سکرٹ پہن رکھی تھی،جو کہ خاصی مختصر تھی۔ہمارے دوست نے انٹرویو کے دوران تنخواہ وغیرہ کے معاملات بھی طے کر لئے اور اسے اگلے دن سے ہی کام پر آنے کا کہہ دیا۔آخر میں خالد بھائی نے خاتون سے کہا کہ باقی سب تو ٹھیک ہے مگر دفتر میں منی سکرٹ پہن کر مت آنا۔بلکہ مکمل جسم ڈھانپ کر آنا۔اس پر خاتون نے کہا کہ یہ لباس تو ہمارا کلچر ہے،اس پر میں سمجھوتا نہیں کر سکتی،وہ نوکری ٹھکرا کر چلی گئی۔ہمارے پاکستانی دوست حیران اس لئے بھی زیادہ تھے کہ اس دوشیزہ کو نوکری کی شدید ضرورت تھی،اور انٹرویو کے دوران اس بات کا اس نے بارہا اظہار بھی کیا تھا،مگر ثقافت سے اس کا لگاؤ شاید ذاتی ضروریات سے بھی بلند تر تھا۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ضرورت ہمیں صرف اپنا موقف بیرونی دنیا تک پہنچانے کی نہیں ہے۔بلکہ بیرونی دنیا کی ثقافتی حساسیت کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔بعض قارئین ہوسکتا ہے اسے خالصتاً مذہبی معاملہ سمجھتے ہوں،مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔کئی سکھ مغرب میں اب تک قتل ہو چکے ہیں چونکہ ان کا حلیہ ہم سے ملتا جلتا ہے۔

بعض دوستوں کو شائد یہ بات بری لگے مگر میں کسی بھی ثقافت کو کسی دوسری ثقافت سے بالاتر یا پھر کم تر تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ میری نظر میں ہر کلچر ایک توازن پر کھڑا ہے اور مختلف ثقافتوں کی مثال باغ میں کھلے ہوئے انواع واقسام کے پھولوں کی طرح ہے، جس میں ہر پھول کا اپنا رنگ اور اپنی خوشبو ہے۔ یہ تمام رنگ اور ساری خوشبوئیں ہی دل آویز ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الثقافتی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ تہذیبوں کے مابین مکالمے کے ذریعے تصادم کی بجائے مفاہمت کا راستہ اپنایا جائے۔

کس برہمن نے کہا تھا یہ سال اچھا ہے

نیا سال نئی امیدوں اور تازہ آرزوؤں کے ساتھ پورے عالم میں اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ مایوسی گناہ ہے، اس لئے نئے شروع ہونے والے برس کے لئے اچھی امیدیں اور نیک تمنائیں رکھنا ہی زیبا ہے۔ گزشتہ سال پوری دنیا میں ہی عمومی طور پر مشکلوں کا سال تھا، جس کی بنیادی وجہ کرونا وائرس کا پھیلاؤ اور اس بیماری کے اثرات تھے۔ پاکستانیوں کی مشکلات کو کرونا کے ساتھ ایک اضافی مشکل، خراب حکومتی کارکردگی نے دو آتشہ کئے رکھا۔ مہنگائی کے طوفان اور بری معیشت کے سبب پیدا ہونے والے مسائل سے نبرد آزمائی کی نسبت سے 2021 پاکستانیوں کی اجتماعی یادداشت کا حصہ رہے گا۔ باقی دنیا کو تو فقط کرونا وائرس کی روک تھام کا چیلنج درپیش تھا، ہمیں مگر کرونا سے بھی بڑے عفریت کساد بازاری کا سامنا تھا۔ آسمان سے باتیں کرتی اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں روزانہ کی بنیاد پر اضافہ ہوتا رہا۔ تیل خوردنی ہو یا پھر ایندھن، تاریخ کی بلند ترین سطح پر اس کے نرخ پہنچ گئے۔ ستم بالائے ستم حکومت نے اس سلسلے میں ایک تشہیری مہم میڈیا پر چلوائی، جس میں امریکہ اور مغربی ممالک میں مقیم پاکستانی نژاد شہری اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں۔

نیو جرسی کے ایک پٹرول پمپ پر گاڑی میں بیٹھی خاتون بتا رہی ہے کہ پہلے کیا بھاؤ تھا اور اب پٹرول فی گیلن کتنا مہنگا ہوا ہے۔ ایک دوسری امریکی ریاست میں پٹرول پمپ پر اپنی گاڑی میں تیل ڈلوانے والا شخص ریٹ بڑھنے کی تصدیق کر رہا ہے۔ ماضی اور حال کے نرخوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ تھا کہ، پس ثابت ہوا کہ ہماری حکومت پاکستان میں مہنگے ایندھن کے سلسلے میں

بری الذمہ ہے۔یہ کمپین چونکہ سوشل میڈیا پر بھی چلائی گئی اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی اشتہار نما پیغامات نظروں سے گزرتے اور سماعتوں سے ٹکراتے رہے۔میرا بڑا دل چاہا کہ امریکی پٹرول پمپ پر کھڑے ان خواتین وحضرات سے پوچھوں کہ آپ کی گاڑی میں پٹرول ڈالنے والے اس مزدور کی ایک گھنٹے کی تنخواہ کتنی ہے؟ مزدور کی اجرت چونکہ امریکہ میں گھنٹوں کے حساب سے ادا کی جاتی ہے ،اس لئے میں ایک گھنٹے کی بات کر رہا ہوں۔فی گھنٹہ 16 ڈالر کم از کم تنخواہ ہے ایک گھنٹے کی ان دنوں وہاں پر۔اگر کوئی شخص ایک دن میں دس گھنٹے کام کرتا ہے تو ظاہر ہے 160 ڈالر ہوں گے، یومیہ تنخواہ ۔پاکستان میں آج کے کرنسی ریٹ سے ڈالر کا حساب لگائیں تو یہ اٹھائیس ہزار روپے بنتے ہیں۔جی ہاں!28000 روپے اس پٹرول ڈالنے والے کی ایک دن کی تنخواہ ہے اگر وہ دس گھنٹے کا م کرتا ہے۔میرے خیال میں پاکستان میں یہی نوکری کرنے والے یا پھر اس سے ملتی جلتی محنت مشقت کرنے والے افراد کی شائد یہ ایک مہینے کی تنخواہ بھی نہیں ہوتی ہے۔اس سے کم ہوتی ہے۔اگر اربابِ اقتدار وطنِ عزیز میں تیل کی قیمتوں کا موازنہ مغربی ممالک کے ساتھ کرنے میں خود کو حق بجانب گردانتے ہیں تو پھر تنخواہوں کا موازنہ بھی عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔عرض یہ ہے کہ اشیائے صرف کی گرانی اور معیشت کی مجموعی گراوٹ تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کرتی ہے۔اس لئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ گزشتہ برس تمام شعبوں سے وابستہ لوگوں کے لئے مشکل رہا بجز حکمرانوں کے۔

تحریک انصاف اور اس کے قائد عمران خان تبدیلی کا نعرہ لگا کر سیاست میں آئے تھے۔دعویٰ ان کا یہ تھا کہ وہ اقتدار میں آکر ملک کے لئے معاشی وسماجی حالات،سیاسی ماحول کو تبدیل کر دیں گے۔روزگار،خوشحالی اور انصاف کا دور دورہ ہوگا۔اقتدار میں آنے کے بعد مگر سب کچھ اس کے برعکس ہوا جو دعوے اور وعدے عوام سے کئے گئے تھے۔تبدیلی مثبت کی بجائے منفی انداز میں رونما ہوئی۔سرائیکی وسیب میں تو یہ طعنۂ مستانہ ٹرک آرٹ کا حصہ بن چکا ہے۔

گھن مزے تبدیلی دے

یعنی لطف اٹھاؤ اب تبدیلی سرکار کے۔گزشتہ برس عوام کی امیدوں کے ٹوٹنے اور حسین

خوابوں کا خون ہونے کا سال تھا۔بحیثیت قوم پاکستانیوں کے ساتھ کم و بیش ویسا ہی معاملہ پیش آیا جیسا ہرنام سنگھ کے ساتھ ہوا تھا۔ پرانے وقتوں کی بات ہے جب دوستوں کے ہمراہ ہرنام سنگھ نے شکار کھیلنے کی غرض سے جنگل کا رخ کیا تھا۔شومئی قسمت وہاں وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔جنگل گھنا اور خطرناک تھا۔واپسی کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش میں وہ مزید بھٹک گیا۔حتیٰ کہ وہ جنگل کے باسی ایک آدم خور قبیلے کے چنگل میں پھنس گیا۔آدم خور قبائلی باہمی مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اسے اپنے سردار کے سامنے پیش کر دیا جائے، وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔وحشی قبیلے کا سردار ایک قدرے اونچی جگہ اپنی مسند پر براجمان تھا۔اس کے اردگرد آدم خور وحشیوں کی بھیڑ لگی تھی، جو شور مچا رہے تھے اور نعرے بلند کر رہے تھے۔غالباً اس بات پر اختلاف رائے تھا کہ ہرنام سنگھ کو کچا چبایا جائے، یا کہ آگ پر بھون کر کھایا جائے۔یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ ہرنام کے منہ سے نکلا ''واہے گرو! آج تو مارے گئے'' اسی اثنا میں ہاتف غیبی کی صدا ہرنام سنگھ کے کانوں میں پڑی کہ ''ہرنام سنگھ! تو مارا نہیں گیا، اپنی کرپان سنبھال اور ان وحشیوں کے سردار کی گردن کاٹ دے'' غیب سے آنے والی آواز کو اس نے واہے گرو کا حکم اور اشارہ سمجھا، کرپان نکال کر وہ آدم خور وحشیوں کی صفوں کو چیرتا، لڑتا پڑتا، بڑی مشکل سے قبیلے کے سردار کے سر پر جا پہنچا اور پہنچتے ہی اس نے سردار کی گردن کاٹ ڈالی۔سردار کی موت دیکھ کر آدم خور قبائلی مزید بپھر گئے اور انہوں نے ہرنام سنگھ کو دبوچ لیا۔اسی لمحے غیب سے ہاتف غیبی کی صدا آئی کہ ہرنام سنگھ تم پہلے نہیں مارے گئے تھے اب مارے گئے ہو۔سچ تو یہ ہے کہ ہماری حالت بھی تبدیلی سرکار آنے سے پہلے قدرے بہتر اور امید افزا تھی۔ہاتف غیبی کی صدا پر جو تبدیلی آئی ہے اس سے عوام کی حالت دگرگوں ہوگئی ہے۔سرنامۂ کلام میں اسداللہ خان غالبؔ کے ایک مصرعے کو گزشتہ برس کے حالات سے ہم آہنگ بنانے کے لئے اس میں ذرا ترمیم کی جسارت کی ہے، جس کے لئے آپ سے بھی معذرت خواہ ہوں، اور مرزا نوشہ کی مبارک روح سے بھی۔درست شعر نئے سال کی نیک تمناؤں کے ساتھ پیش کر کے اجازت چاہوں گا۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ایک تھا گورباچوف

سابق سوویت یونین کے آخری سربراہ میخائل گورباچوف کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔نئی نسل کی اکثریت کو تو شاید اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ منہدم ہونے والی سوویت ریاست کیسی قہرمان اور پرشکوہ ہوتی تھی۔گورباچوف نے 91 برس کی عمر پائی اور وہ ایک پورے عہد کا استعارہ تھے،جس کا خاتمہ امکانی طور پر ان کی موت کے ساتھ ہی ہوگیا،وہ گزشتہ پوری ایک صدی کی سیاسی تاریخ کے اہم کردار اور عینی شاہد تھے۔بیسویں صدی کو مورخین کی اکثریت دو عالمی جنگوں اور کمیونزم کے عروج وزوال کی کہانی سے تعبیر کرتے ہیں اور ان سے ہی منسلک سرد جنگ، جو کہ امریکہ اور روس کے درمیان کم وبیش تمام صدی جاری رہی۔گرچہ سوویت یونین 21 ریاستوں کا اتحاد تھا مگر روس چونکہ رقبے و آبادی کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑا تھا اس لئے اکثر لوگ اسی کے نام سے ہی اس اتحادی ریاست کو پکارتے تھے۔سوویت ریاست میں فقط ایک ہی پارٹی ہوا کرتی تھی اور وہ کیمونسٹ پارٹی تھی،جیسا کہ چین میں ہے۔اس پارٹی کا جنرل سیکرٹری عموماً ملک کا صدر ہوتا تھا۔گورباچوف پہلے کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے اور 1985 میں انہوں نے عنان اقتدار سنبھال لی۔ان کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی سوویت یونین کا بھی خاتمہ ہوگیا اور اس کے حصے بخرے ہوگئے۔ان کے حامی انہیں شخصی آزادی اور کھلے پن کے حامی کے طور پر یاد کرتے ہیں مگر روس کے اندر ان لوگوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔روسی عوام کی اکثریت ان سے نفرت کرتی ہے اور انہیں تاریخی زوال وذلت کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔

روس کے موجودہ صدر ولادی میر پوتین نے میخائل گورباچوف کی آخری رسومات میں شرکت سے احتراز برتا ہے۔ جنازے میں عدم شرکت کی وجہ پہلے سے طے شدہ سرکاری مصروفیات بیان کی گئی ہیں، مگر اصل وجہ شاید لوگوں کی گورباچوف سے نفرت اور انہیں زوال کی علامت سمجھنا ہے۔ ایسے عالم میں جب روسی فوجیں یوکرائن میں محاذ جنگ پر مصروف ہیں، گورباچوف ایک کمزوری کا استعارہ ہونے کے سبب سرکاری جنازے سے محروم رہے اور انہیں کسی سرکاری اعزاز کا حق دار بھی نہیں سمجھا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ صدر پوتین گورباچوف کو شدید ناپسند کرتے ہیں اور عموماً یہ بات چھپاتے بھی نہیں ہیں۔ نوے کی دہائی میں روس میں برپا کساد بازاری اور طواف الملوکی کا سبب وہ گورباچوف کو جانتے ہیں۔ ورنہ صدر یلسن کا جنازہ تو سرکاری سطح پر منعقد کروایا گیا تھا اور ولادی میر پیوتن نے اس میں خود بھی شرکت کی تھی۔ سوویت یونین کے متعلق پوتین کا کہنا ہے کہ جو آدمی سوویت عہد کو یاد نہیں کرتا اس کے سینے میں دل نہیں ہے اور جو انسان اس عہد کو واپس لانا چاہتا ہے اس میں دماغ نہیں ہے۔

گورباچوف کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ وہ سادہ دل اور کمزور اعصاب کے آدمی تھے، گرچہ اس کے ساتھ ساتھ عالمی امن کے بھی حامی تھے، مگر امن کی خواہش کو بھی اس دنیا میں کمزوری سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔ سیاستدان ہونے کے باوجود وہ مغربی سفارتکاروں پر اعتماد کرتے تھے، جو کہ آخری تجزیے میں ان کی غلطی ہی شمار ہوگی۔ انہوں نے امریکی اور مغربی یورپ کے ساتھ سرد جنگ کا خاتمہ کیا مگر اس کے ساتھ ہی دنیا کی سب سے بڑی ریاست کے بھی حصے بخرے کر دیے۔ اکتوبر 1917 میں بائیں بازو کے نظریات رکھنے والے انقلابی کارکنوں کی سرخ سپاہ کی زار روس کی وفادار سفید فوج پر فتح پانے کے نتیجے میں جونئی اشتراکی ریاست تشکیل پائی تھی، جس کا نام یونین آف دی سوویت سوشلسٹ ریپبلک رکھا گیا، جس کا نصب العین محنت کشوں، کسانوں، مزدوروں اور پرولتاریہ کے حقوق کی نگہداشت تھا، جس کے پہلے سربراہ ولادی میر لینن اور پہلے آرمی چیف لیون ٹراٹسکی تھے، جو کہ گوریلا جنگ کا خود ایک اساطیری کردار ہیں۔ جس

کے ہراول دستے میں جوزف اسٹالن تھے جنہوں نے لینن کے بعد اقتدار سنبھالا تو ایک مکمل زرعی معاشرے کو صنعتی معاشرے میں تبدیل کر دیا، ایڈولف ہٹلر اور ان کے نازی نظریات کو میدان جنگ میں شکست فاش دے کر دوسری جنگ عظیم کے فاتح کہلائے، جس ریاست نے پہلی مرتبہ بنی نوع انسان کو خلاؤں کی وسعتوں سے روشناس کروایا، جب سوویت خلانورد یوری گاگرین پہلے انسان قرار پائے جو ''سپوتنک'' نامی خلائی شٹل پر بیٹھ کر زمین کے مدار سے باہر نکل گئے اور آج کے مواصلاتی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ دنیا میں یہ ملک امریکہ کے ہم پلہ سپر پاور کہلاتا تھا، مگر جب گورباچوف اپنے ساتھیوں کی مدد سے اقتدار میں آئے تو تعمیر نو کا نعرہ لگایا، کیمونسٹ پارٹی کا یہ دھڑا اصلاح پسند اور زیادہ شخصی آزادی کا حامی تصور کیا جاتا تھا۔ معاشی جمود کو توڑنے کے لئے یہ لوگ کھلی معیشت کی بات کرتے تھے۔ جو کہ سرمایہ دارانہ نظام میں منڈی کے تصور سے گرچہ مختلف خیال تھا مگر پھر بھی کانوں کو بھلی لگتی بات تھی۔ ''پری استرویکا'' کا نعرہ لگا کر جب گورباچوف کرسئ صدارت پر براجمان ہوئے تو ہر آنے والے دن کے ساتھ روس کی معیشت بیٹھتی ہی چلی گئی۔ یہ تعمیر نو کا عہد آج بھی اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس میں تمام سوویت یونین میں شامل ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ داخلی خودمختاری دینا شامل تھا، مگر خراب معیشت، بدانتظامی اور نااہلی نے اس ریاست کا ہی خاتمہ کر دیا۔ مقام عبرت ہی کہوں گا کہ کہاں دنیا کی سپر پاور کا مطلق العنان سربراہ اور کہاں پیزا ہٹ اور لوئی ووٹون کی مشہوریوں کے لئے اشتہار میں ماڈلنگ کرتا پھرتا ایک آدمی میخائل گورباچوف۔ بے شک سدا بادشاہی نیلی چھتری والے میرے رب کی ہے۔

اسی کی دہائی کے چند فوجی افسر جنہیں محترمہ بے نظیر بھٹو جہادی جرنیل کہا کرتی تھیں، وہ سوویت یونین کے خاتمے کا کریڈٹ لیتے رہے ہیں۔ جبکہ حقائق اس کے برعکس نظر آتے ہیں جب آپ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تعمیر نو جسے ''پری استرویکا'' کہا جاتا ہے۔ روس کی کیمونسٹ پارٹی کا خالصتاً اندرونی فیصلہ تھا۔ سوویت ریاستوں پر آزادی یوں کہہ لیں کہ مسلط کی گئی تھی۔ ان ممالک کو آزادی سے دوچار ہونا پڑا تھا جبکہ عوامی سطح پر کوئی بھی علیحدگی کی تحریک موجود نہ تھی۔ یہ الگ حقیقت

اپنی جگہ موجود ہے کہ سوویت یونین کے خاتمے کا نقصان پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک کو سب سے زیادہ ہوا۔ وہ یوں کہ دنیا میں طاقت کا توازن ختم ہوگیا۔ عالمی منظرنامے میں امریکہ کا کردار پولیس مین، تھانیدار کا بن گیا۔ اب تو چین عالمی سطح پر ایک معاشی وعسکری طاقت بن کر ابھرا ہے اور روس نے بھی انگڑائی سی لی ہے ،ورنہ تو سوویت یونین کے خاتمے کے بعد دو دہائیاں امریکہ بہادر دنیا کی واحد سپر پاور بن کر راج کرتا رہا۔ جہاں جی چاہتا، جب جب چاہتا حملہ آور ہوجاتا، جس ملک کا چاہتا ناطقہ بند کر دیتا۔ کوئی دوسرا ملک اس کے خلاف کھڑا ہونا تو دور کی بات ہے، آواز اٹھانے والا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سرد جنگ کے زمانے میں پاکستان جیسے ممالک کی یوں قدردانی کی جاتی کہ کہیں مخالف کیمپ میں نہ چلے جائیں، مگر سوویت یونین کے خاتمے کے بعد دنیا ''یونی پولر'' ہوگئی اور ایک ہی قطب نمارہ گیا تھا جو کہ امریکہ تھا۔ تاریخ میں گورباچوف کو ایک نااہل حکمران کے طور پر یاد رکھا جائے گا، جو اس عہدے کے قابل نہیں تھا جس پر اسے فائز کیا گیا۔ قوموں کی زندگی میں ایسے حادثات ہوجاتے ہیں جب ایسے کم نظر اور نالائق لوگ تخت نشین ہوجاتے ہیں، جن کا خمیازہ ریاستوں کو اپنے وجود کی قیمت سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ فرض کریں اگر موجودہ روسی صدر ولادی میر پوتین یا اس جیسا لیڈر اس وقت گورباچوف کی جگہ سوویت یونین کا صدر ہوتا تو آج ہم ایک مختلف دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ۔مغربی میڈیا کا یہ کہنا ہے کہ گورباچوف نے سنسرشپ کا خاتمہ کیا اور سوویت یونین کے گرد تنے ہوئے آہنی پردے کو گرایا، یہ بات بڑی حد تک سچ ہے مگر مذکورہ آہنی پردے کو گراتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ سوویت یونین بھی شاید اسی نے گرایا ہے۔ یہ 1991 کی کرسمس کا دن تھا جب سوویت یونین اور گورباچوف کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ جس طرح شہید مر کر بھی زندہ ہوتے ہیں اسی طرح بعض سیاسی رہنما جیتے جی ہی مرجاتے ہیں۔ گورباچوف بھی ایسے ہی لیڈر تھے جن کے تاریخی کردار کا انتقال تو ان سے انتقال اقتدار کے ساتھ ہی ہوگیا تھا، ان کی طبعی موت اس ہفتے ہوئی ہے۔

براہموس میزائل کا میاں چنوں گرنا

رواں برس بہار کی یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ پاکستان کی سب سے اہم اور مصروف شاہراہ جی ٹی روڈ کے کنارے میاں چنوں میں آسمان سے کوئی جلتی ہوئی چیز دھماکے کے ساتھ آ گری۔ مقامی لوگوں نے سمجھا کہ شاید فضائیہ کا کوئی تربیتی طیارہ حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ پاک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ نے یہ انکشاف کیا کہ یہ بھارتی میزائل تھا۔ میں تو اسے خوش قسمتی کہوں گا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ورنہ پہلا امکان تو یہ تھا کہ فضا میں محو پرواز کسی مسافر طیارے کو یہ میزائل لگ سکتا تھا۔ چونکہ اس نے سو کلومیٹر ہندوستان کی فضائی حدود میں طے کرنے کے بعد پاکستانی فضائی حدود میں 124 کلومیٹر کا فاصلہ تیس سے چالیس ہزار میٹر کی بلندی پر طے کیا تھا۔ دوسرا جس جگہ یہ ہائپرسونک کروز میزائل گرا، وہاں اس وقت لوگوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ اس حادثے کی خبر ہندوستانی میڈیا کو پاکستان کی طرف سے ملی اور اس کے تیسرے دن ہندوستان نے تسلیم کیا کہ غلطی سے اس نے میزائل فائر کر دیا تھا۔ انڈیا کے وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ نے اس موقع پر کہا کہ اس کا ملک اپنے ہتھیاروں کے نظام کا از سرِ نو جائزہ لے گا اور اس کے ساتھ ہی اس واقعے کی اعلیٰ سطحی تحقیقات کا بھی اعلان کر دیا۔

گزشتہ روز ہندوستانی فوج کے ترجمان نے یہ بیان دیا ہے کہ پاکستانی حدود میں غلطی سے میزائل فائر کرنے کی پاداش میں بھارتی فضائیہ کے تین افسران کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ نیز تحقیقاتی کمیشن کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد 23 اگست سے یہ فوجی افسران مبینہ طور پر نکالے گئے

ہیں۔ برطرف ہونے والے بھارتی فضائیہ کے افسران کے نام توصیغۂ راز میں رکھے گئے ہیں مگران کے عہدے یوں بیان کئے گئے ہیں، ایک اسکوارڈن لیڈر، ایک ونگ کمانڈر اور ایک گروپ کیپٹن اس میں شامل ہیں۔ بھارتی فضائی میں نشر ہونے والی رپورٹ کے مطابق مذکورہ میزائل مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ کے ائیر پورٹ سے بھیجا گیا تھا۔ کورٹ آف انکوائری کے مطابق تحقیقات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ مبینہ طور پر برطرف افسران نے قوائد وضوابط سے انحراف کیا تھا جس کے نتیجے میں 9 مارچ کو یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ میں نے اس مقام کا بذات خود دورہ کیا ہے جہاں یہ براہموس میزائل گرا تھا۔ گرچہ دفاعی اداروں نے ابھی تک اس مقام کے گرد باڑ لگا رکھی ہے مگر شکستہ دیواریں اب بھی سارا واقعہ بیان کر رہی ہیں۔ یہ جگہ برلب سڑک ہے، بخشو ملھن ہوٹل کے بالکل پاس اور میرے گھر سے چند منٹ کی دوری پر واقع ہے۔ میاں چنوں کے لوگوں کو مذکورہ شب زوردار دھماکے کی آواز ابھی تک یاد ہے اور بہت سارے سوالات ابھی تک ہمارے ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔

اس جانب پاکستان کی وزارت خارجہ نے ان تحقیقات اور ان کے نتیجے میں بھارتی اقدامات کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اگرچہ اس واقعے میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا چونکہ کروز میزائل پر وار ہیڈ جسے آپ بارود کہہ سکتے ہیں، نصب نہیں کیا گیا تھا، اور اگر تھا بھی تو وہ فعال نہیں تھا۔ ہماری خارجہ امور کی وزارت کی طرف سے جاری کئے گئے بیان میں کہا گیا ہے کہ انہیں پہلے بھی یہی توقع تھی، گویا کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھے۔ ہندوستان کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات اور کورٹ آف انکوائری کے نتائج اور اس کی طرف سے دی گئی سزائیں مکمل طور پر غیر تسلی بخش، ناقص اور ناکافی ہیں۔ یہ شکوہ بھی کیا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے مشترکہ تحقیقاتی کمیشن کے قیام سے متعلق پاکستانی مطالبے کو نظر انداز کیا گیا ہے، اس موقع پر دوبارہ پاکستان نے اپنے مطالبے کو دہرایا ہے۔ مزید برآں ہندوستان نے اس معاملے کو بظاہر سرد خانے میں ڈال دیا ہے۔ اس بابت راج ناتھ سنگھ کے بیانات محض لفاظی اور زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ بھی قرار نہیں دیے جا سکتے۔

یادرہے کہ براہموس اس وقت دنیا کارفتار کے اعتبار سے تیز ترین کروز میزائل ہے۔اس سپرسانک میزائل کوروس اور بھارت نے مشترکہ طور پر تیار کیا ہے اوراس کا نام ہندوستانی دریابرہماپترااورروسی دریاموسکوا کامخفف ہے۔گرچہ اس کی بنیادروس کا بحری جہازشکن نظام P800 اونکس ہے مگرمیڈیم رینج کے سٹیلتھ میزائل کوآبدوزاور بحری جہاز کے علاوہ لڑاکا طیارے اورزمین سے بھی فائر کیا جاسکتا ہے۔اٹھائیس فٹ لمبا،دوفٹ چوڑا،دوسو سے تین سوکلوگرام بارود لے جانے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے،صرف ایک میزائل کی قیمت 5 ملین امریکی ڈالریاایک ارب روپے سے کہیں زیادہ ہے۔اسی تناظر میں یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے کہ یہ حادثہ واقعی SOP سے انحراف کا نتیجہ تھایاپھرسوچی سمجھی سازش کے تحت ہمیں پیغام دیا گیاہے؟اس واقعے سے مجھے اپنے کالج کے دنوں کاایک وقوعہ باربار یاد آتا ہے۔جب طالب علموں سے بھرے ہمارے لاہورمیں واقعے گورنمنٹ ہوسٹل کےایک کمرے میں،طلباءتنظیم اسلامی جمعیت طلباء کے کالج ناظم کی شلوار کے نیفے سے اڑسا ہوا غلطی سے پستول پھسل کرفرش پرگرپڑا تھا۔ناظم صاحب کے نیفے سے پستول پھسل کرگرنااورمیاں چنوں میں ہندوستانی میزائل کا گرنا مجھے اتفاقیہ اوربےسبب نہیں لگتے ہیں۔میری توہم پرستی یاسوئےظن کہہ لیجئے کہ مجھے ان میں ایک پیغام دکھائی دیتا ہے۔ہندوستان کی جانب سے قائم کردہ کورٹ آف انکوائری اوراس کی رپورٹ فقط آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہے۔ہٹ دھرم مودی سرکارنے توپہلے میزائل گرنے کے واقعے کا ہی انکارکردیا تھا،بعدازاں بوجوہ اقرارکرناپڑا۔عالمی برادری کے سامنے سوال یہ ہے کہ ہندوستان جیسے غیرذمہ دارملک کے پاس وسیع پیمانے پرتباہی پھیلانے والے ایسے ہتھیار ہونا چاہئیں؟بھارتی ہاتھوں میں ایسے خطرناک ہتھیارصرف ہمارے شہروں کے لئے ہی خطرہ نہیں ہیں بلکہ عالمی امن کے لئے بھی خطرے کی گھنٹی ہیں۔

بےحدافسوس اوردکھی دل کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ عمران خان حکومت نے عالمی سطح پراس مسئلےکواس طرح اجاگرنہیں کیا جتنی زیادہ اہمیت کا حامل یہ معاملہ تھا۔اقوام متحدہ اوردیگردستیاب عالمی امن کے لئے قائم کردہ کسی فورم کواستعمال کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔یہ ثابت کرنے

میں ذرا بھی سنجیدگی نہیں دکھائی کہ بھارت ایک غیر ذمہ دار اور نا قابل بھروسہ ملک ہے جس کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار غیر محفوظ اور عالمی امن کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں۔ ذاتی تشہیر کے لئے جس طرح قومی اور بین الاقوامی میڈیا کو استعمال کیا جاتا ہے، دھرتی سے جڑے اس قومی مسئلے کی اس طرح تشہیر نہیں کی گئی۔ اگر یہ سوچی سمجھی غلطی نہیں تھی تو تب بھی اس واقعے کو گزشتہ حکومت کی کمزوری کے طور پر ضرور یاد رکھا جائے گا۔ قومی تاریخ میں اس سانحے پر ہمارے ردعمل کو اچھے لفظوں میں تحریر نہیں کیا جائے گا۔

نئی سحر کی امید

مہنگائی اپنے عروج پر ہے۔ بے روزگاری ملکی تاریخ کی بلند ترین سطح پر جا پہنچی ہے۔ معاشی شرح نمو گزشتہ ربع صدی کی پست ترین بتائی جارہی ہے۔ ایسے عالم میں روشن صبح، نئے دن کی نوید اور اچھے دنوں کی امید رکھنے کی تلقین حقیقت پسندی سے زیادہ سیاسی نعرے بازی لگتی ہے۔ موجودہ حکومت کی مستقل پالیسی یہ رہی ہے کہ ہر خرابی کی ذمہ داری گزشتہ حکومتوں پر ڈال کر خود کو بری الذمہ ثابت کر دیا جائے۔ پہلے ایک، دو برس تو یہ بات کسی حد تک قبول بھی کر لی جاتی کہ نئے نئے آئے ہیں۔ مگر اب تو چوتھا برس بھی آدھا گزرنے والا ہے۔ اتنے ترجمان چشم فلک نے آج تک کسی حکومت کے نہیں دیکھے، جتنے موجودہ عہد میں سامنے آئے ہیں۔ ترجمانوں کی اس فوج ظفر موج کی بنیادی ذمہ داری اپوزیشن اور حکومتی مخالفین کو گالیاں دینے کے علاوہ عمران خان کے ذاتی اوصاف حمیدہ بیان کرنا محسوس ہوتی ہے، جو غالب کے الفاظ میں یوں ہے

تیرے جواہر طرفِ کلاہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

مسئلہ مگر یہ ہے کہ حکومتی کارکردگی اچھی نہیں ہے۔ اس کابینہ کی کارکردگی کو ناکارکردگی کہنے کو دل چاہتا ہے۔

تعمیراتی منصوبے اس حکومت کی روزاول سے ترجیح نہیں تھے۔اس بابت ان کا خیال تھا کہ سڑکیں وغیرہ بنانے سے قومیں سربلند نہیں ہوسکتی ہیں، حیرت بھی نہیں ہوئی اگر وعدہ کردہ پچاس لاکھ گھروں میں سے ابھی تک پانچ ہزار بھی تعمیر نہیں کیئے گئے۔مہنگائی مگر اس قدر زیادہ ہوجائے گی یہ کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا۔مخالفین کا ذکر ہی نہیں کرتے ، جو اِس بندوبست کے حامی تھے ان کے گمان میں بھی یہ گرانی کا منظر نہیں تھا۔مہنگائی وہ موضوع اور عمل ہے جس سے ہر شہری متاثر ہوتا ہے۔بجلی، پٹرول، گیس کسی خاص طبقے کے پاکستانی کی نہیں بلکہ ہر فرد کی ضرورت ہے اور اس کی قیمت میں اضافے سے ہر گھرانہ متاثر ہوتا ہے۔چینی ، گھی، آٹا بنیادی انسانی ضرورتیں ہیں، ان کی ارزانی سے اور گرانی سے بھی ہر گھر کو فرق پڑتا ہے۔ مجھے ایک سندھی ہندو دوست کی دادی کا سنایا ہوا یہ سرائیکی مقولہ ہمیشہ یاد رہتا ہے، وہ خاندانی طور پر چونکہ ملتان سے ہیں۔

ے پیٹ نہ پئیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں

یقین کیجئے حکومت کی مخالفت مقصود نہیں، لوگوں کی حالت زار دیکھ کر آج کل ہر اہل دل رنجیدہ ہے۔سفید پوش طبقے کو روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ محنت کشوں کے حالات ان سے بھی زیادہ مشکل اور تلخ ہیں۔معیشت کی مستقل گراوٹ سے لاکھوں لوگ بے روزگاری کا شکار ہو گئے ہیں، ایک کروڑ نوکریاں دینے کا وعدہ اگر عمران خان پورا کرنا بھی چاہیں تو موجودہ معاشی حالات میں یہ اب ممکن بھی نہیں رہا۔آئی ایم ایف نے ہماری گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کے لئے ایک ارب ڈالر قرضہ جاری کیا ہے۔ستم ظریفی مگر یہ ہے کہ یہ انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ جب قرضہ دیتا ہے تو اس کے ساتھ کڑی شرائط بھی عائد کرتا ہے۔اس عالمی معاشی ادارے کی شرائط کا لازمی نتیجہ مزید مہنگائی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ یہ ناگزیر عمل ہے۔اگر ملک میں کوئی چیز سستی آج مل بھی رہی ہے تو وہ آئندہ نہیں ملے گی۔مہنگی چیزیں مزید مہنگی ہو جائیں گی۔ نئے ٹیکس عوام پر لاگو کیئے جائیں گے۔اگر کسی شعبے

میں ٹیکس کی کوئی چھوٹ تھی بھی تو وہ ختم کر دی جائے گی۔آنے والے دن مزید مشکل دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے عالم میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ غم دل کا سفینہ کہاں جا کر رکے گا؟ کب یہ مہنگائی کا طوفان تھمے گا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ موجودہ حکومت سے اب کوئی امید نہیں ہے کہ یہ معیشت اور ملک میں کوئی انقلابی تبدیلی لے کر آ جائے۔اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کے جانے کے بعد ہی کوئی مثبت سمت کی طرف معیشت کا سفر شروع ہوگا۔بہلول دانا کی وجۂ شہرت درویشی کے علاوہ شاہی خاندان سے تعلق بھی تھی۔خلیفہ ہارون الرشید نے ایک بار اسے دربار میں طلب کیا،خلیفہ بھی جانتا تھا کہ بہلول اللہ سے قرب رکھنے والا شخص ہے،اگرچہ رشتے میں اس کا کزن ہی ہے۔ہارون الرشید نے بہلول سے مخاطب ہو کر التجا کی کہ میرے حق میں دعا کرو۔بہلول دانا نے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور کہا کہ اللہ کرے تو مر جائے۔اس پر ہارون الرشید نے کہا کہ اے بندۂ خدا، یہ تو نے میرے حق میں کیا دعا کی ہے؟ یہ تو بد دعا ہے۔اس پر بہلول نے کہا کہ نہیں،خلیفہ میں نے تمہارے حق میں ہی دعا کی ہے ۔تم جتنی زیادہ دیر زندہ رہو گے،تمہارے گناہ بھی اتنے ہی بڑھتے چلے جائیں گے۔جتنی جلدی تم مر جاؤ گے،تمہارے گناہ بھی اتنے ہی کم ہوں گے۔بات امید سے شروع ہوئی تھی۔کہ بہتری کی کیا امید ہے؟ موجودہ ملکی حالات اور معاملات کو دیکھا جائے تو اس میں بہتری کی واحد صورت یہ نظر آتی ہے کہ اس حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔اب یہ خوش فہمی دور ہو چکی ہے کہ موجودہ حکمرانوں میں کوئی اہلیت ہے، اچھی تبدیلی لانے کی۔وقت اور تجربے نے ثابت کیا ہے کہ ان میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے جو پاکستان کو ترقی دینے کے لئے درکار ہے۔نئی سحر کی امید یہی ہے کہ یہ حکمران ٹولہ اب رخصت ہو جائے۔

منحصر جس کی ہو مرنے پہ امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

پاکستان کی معاشی گراوٹ اور عالم دیگر

معیشت ہمارے ہاں کوئی دلچسپ موضوع نہیں سمجھا جاتا ہے۔مسئلہ مگر یہ ہے کہ ہمیں معاشیات کے مضمون سے دلچسپی ہو یا نہ بالکل بھی نہ ہو، یہ ہماری اجتماعی قومی زندگی کا سب سے اہم معاملہ ہے۔جن لوگوں کو معاشیات کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں ہے،ان کی زندگی بھی اقتصادی اتار چڑھاؤ سے اتنی ہی متاثر ہوتی ہے جتنی کسی ماہر معاشیات کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہمارے اہل قلم میں بھی یہ موضوع کبھی مقبول نہیں رہا،جس کی وجہ شائد یہ بھی ہے کہ اردو مصنفین میں علمی و ادبی موضوعات پر اظہار خیال کو ترجیح دی جاتی ہے۔مشکل مگر یہ ہے کہ ہماری ترجیحات کی ترتیب سے زمانے کا رخ متعین نہیں ہوتا۔یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ نے بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ انہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔بعض خواتین وحضرات سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ انہیں سیاست دوراں سے نفرت ہے۔عرض اس بابت یہ ہے کہ کسی کو سیاست سے عدم دلچسپی ہو یا پھر نفرت و بیزاری،آپ کی اجتماعی قومی زندگی اور ملک کے مستقبل پر سیاست کے اثرات اور اہمیت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔حتیٰ کہ آپ کی ذاتی زندگیوں پر حکومتی پالیسیوں کے اچھے یا برے اثرات سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ملک میں مہنگائی کی تپش ہر شہری کے گھر پہنچتی ہے اور اگر ارزانی ہو تو آسانی کی ٹھنڈی ہوا بھی ہر فرد محسوس کرتا ہے۔

پاکستان آبادی کے اعتبار سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔صورتحال یہ ہے کہ تمام معاشی اعشاریے سرنگوں ہیں اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔روپے کی قدر اپنی تاریخی پست ترین

سطح پر اور بے روزگاری ملکی تاریخ کی بلند ترین سطح کو پہنچ چکی ہے۔ معاشی شرح نمو قیام پاکستان کے بعد کبھی بھی منفی میں نہیں تھی مگر گزشتہ برس یہ سفر سے بھی نیچے رہی۔ کچھ مہربان موجودہ معاشی زبوں حالی کا سبب کرونا وبا کو گردانتے ہیں، مگر عرض یہ ہے کہ یہی کرونا، اسی حشر سامانی کے ساتھ سرحد کے اس پار انڈیا اور بنگلہ دیش میں بھی آیا۔ بنگلہ دیشی معیشت دنیا کی تیز ترین شرح نمو کی حامل سات ممالک میں سے ایک معاشی حقیقت ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت بنگالی آبادی ہم سب سے زیادہ اور معاشی اعتبار سے پچھڑے ہوئے تھے۔ آج معمالہ الٹا ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش کی معیشت کا حجم ہم سے سوا رب ڈالر زیادہ ہے۔ ان کی ایکسپورٹ ہم سے دوگنا ہوگئی ہے اور زرمبادلہ کے ذخائر پہلے تو دوگنا تھے، اس سال کئی گنا زیادہ ہو گئے ہیں۔ اگر موجودہ معاشی رجحان اور سیاسی انتظام برقرار رہتا ہے تو قوی امکان ہے کہ معیشت کا مجموعی حجم بھی بنگلہ دیش کا ہم سے دوگنا ہو جائے گا۔

اس وقت ہندوستان کی معیشت کا حجم روس، برازیل اور کینیڈا سے بھی بڑھ چکا ہے۔ بھارت پونے تین کھرب ڈالر کی ڈی پی کے ساتھ دنیا کی ساتویں بڑی معیشت بن گیا ہے۔ آئندہ چند ہی سال میں وہ فرانس اور برطانیہ سے بھی معاشی اعتبار سے آگے نکل جائے گا۔ اگر معاشی رجحان یہی رہتا ہے۔ یعنی دنیا کی پانچویں بڑی معاشی واقتصادی قوت۔ یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ یہ میرا ذاتی خیال، رائے یا خواہش بالکل بھی نہیں ہے، آئی ایم ایف کے جاری کردہ اعداد وشمار ہیں۔ یاد رہے کہ دنیا کی پہلے تین بڑی معاشی قوتیں بالحاظ پیداوار بالترتیب امریکہ، چین اور جاپان ہیں۔ بھارت اس وقت چین اور امریکہ سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ رقی کر رہا ہے، متوقع شرح نمو نو فیصد جبکہ بنگلہ دیش کی موجودہ متوقع شرح نمو ہندوستان سے بھی زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ امریکہ سات فیصد اور چین کی معیشت آٹھ فیصد کی شرح سے ترقی کر رہی ہے۔ آئی ایم ایف کے مطابق دنیا کی اوسط معاشی نمو چھ فیصد رہنے کی اس برس توقع ہے۔ ہمارے ملک کے بارے میں توقع اس اوسط سے بھی آدھی، یعنی تین فیصد رہنے کی ہے۔

ہمارے عموماً امریکی عسکری قوت اور خارجہ پالیسی زیر بحث رہتی ہے مگر شاذ ہی امریکہ کا

اقتصادی ڈھانچہ اور معیشت کا حجم ہماری گفتگو کا موضوع بنتا ہے۔حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ امریکی دفاعی طاقت اور خارجی معاملات میں اسکی بے پناہ قوت کا سرچشمہ اس کی معیشت ہے۔عالمی منڈی پر امریکی کنٹرول ہے جو اس کے مکالفین کو گھٹنوں کے بل لے آتا ہے۔امریکی ڈالر اب عالمی کاروبار کی کرنسی ہے۔جب ڈالر ایک ملک سے دوسرے ملک کسی بھی بنک کے ذریعے جاتا ہے تو پہلے یہ رقم نیویارک کے کسی بھی بنک میں چلی جاتی ہے،امریکی بنک اس رقم کی منتقلی کی اجازت دیتا ہے تو یہ تیسر ملک جاتی ہے ورنہ ممکن ہی نہیں ہے۔امریکہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہے،اس وقت جس کا حجم اکیس کھرب ڈالر ہو گیا ہے۔

بات اگر عسکری قوت اور اسلحے کے مقابل ء کی ہو تو سوویت یونین کسی طور پر بھی امریکہ سے پیچھے یا کمتر نہیں تھا۔گزشتہ صدی کے بیشتر حصے میں وہ امریکہ کے مقابلے کی کی دفاعی سپر پاور رہا۔سوویت یونین کے ٹوٹنے کے اسباب خالصتاً معاشی تھے۔معیشت روسی کیمونسٹوں سے چل نہیں پا رہی تھی۔ورنہ امریکہ بیس سال بعد افغانستان سے نکلا تو اس کی قائم کردہ کٹھ پتلی حکومت تین ہفتے بھی نہیں نکال سکی،جبکہ سوویت یونین دس برس گزار کر جب افغانستان سے نکلا تو اس کی قائم کردہ حکومت تین سال تک بغیر کسی بیرونی امداد کے قائم رہی۔یہاں تک کہ ہمارے جنرل حمید گل نے جب جلال آباد پر حملہ کروایا تو بری طرح ناکام ہوئے،حالانکہ روس تو افغانستان سے نکل چکا تھا۔اسی نسبت سے پیر پگاڑا ہمارے جنرل حمید گل کو فاتح جلال آباد کہہ کر بلاتے تھے مگر یہ تذکرہ پھر کبھی سہی۔سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد منظر یہ تھا کہ روسی کسانوں نے ٹینکوں میں ترمیم کر کے انہیں ٹریکٹر کے طور پر انہیں کھیتوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔گولے پھینکنے کے پائپ فصلوں میں نکاسی آب کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔بکھرنے والے سوویت سماج دے نئی تشکیل پانے والی نوزائیدہ ریاستوں کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ اسے تلف کرنا مشکل ہو رہا تھا۔قازقستان کے حصے میں آئے ایٹمی اسلحے کو تلف کرنے کے لئے تو اقوام متحدہ نے باقاعدہ اسکی مدد کی،یوں اس کا ایٹمی پروگرام ختم ہو۔

انیسویں صدی کے سب سے عظیم جرنیل مانے جانے والے نپولین بونا پارٹ،جنہوں نے

فرانس کو بام عروج پر پہنچایا،ان کا یہ قول پوری دنیا میں نقل کیا جاتا ہو،''فوجیں پیٹ کے بل چلتی ہیں''یعنی اقتصادی وسائل اور معاشی سہولیات میسر ہوں تب ہی فوجی جوان محاذ جنگ پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔بھوکے پیٹ فوج کے لئے آگے کا سفر کرنا محال ہوتا ہے۔ہمارے وزیراعظم سمارٹ بھی ہیں اور بانوے کا ورلڈ کپ بھی انہوں نے جیتا ہے مگر معیشت چلانے میں وہ مکمل ناکام رہے ہیں۔اپنی معاشی ٹیم میں پے در پے تبدیلیوں کے باوجود اقتصادی شعبے میں ناکامیوں کا یہی سلسلہ آگے چلتا ہوا نظر آرہا ہے۔

کتاب سے بہتر کوئی جلیس نہیں

تابندہ عرب شاعر امراء القیس نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ بات کہی تھی مگر آج بھی حرف بہ حرف سچ محسوس ہوتی ہے، عالمی صداقت لگتی ہے کہ کتاب سے برتر کوئی انسان کا ساتھی نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں بسنے والے نامور مصنفین کا چرچا تو ہمیشہ ہمارے ذرائع ابلاغ میں رہتا ہے مگر مضافات میں قیام پذیر بڑے اچھے اور معتبر لکھاری بھی بعض اوقات نظرانداز کر دیے جاتے ہیں۔ آج میں آپ سے دو کتابوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو حال میں ہی شائع ہوئی ہیں اور ان کے خالق جنوبی پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ رمضان المبارک کی نسبت سے ایک تو نعتیہ مجموعہ ہے جس کو حاصل پور میں مقیم نامور ادیب اور شاعر محمد امین ساجد سعیدی نے تخلیق کیا ہے، دوسری کتاب خانیوال سے تعلق رکھنے والے ہمارے شاعر دوست فہیم ضیاء کی شائع ہوئی ہے، مصنف تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں اور آج کل مسقط عمان میں مقیم ہیں۔ پہلے میں مدحت شاہ کونین کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، چونکہ ادب کا تقاضا بھی یہی ہے۔

حضور پاکؐ کی نعت کہنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ مسلسل نعت کہنا اور نعت گوئی کو طرزِ حیات بنالینا خوش بختی کی بات ہے۔ محمد امین ساجد سعیدی بڑے نصیب والے ہیں کہ دو جہاں کے سردار کی شان میں نعتیں کہتے کہتے ان کا ایک نعتیہ مجموعہ بن گیا۔ سرکار دو عالمؐ سے محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ اس لئے نعت گوئی کا سفر ایک مجموعے کی اشاعت پر بھی تمام نہیں ہوا، بالکل اور زیادہ جوش و جذبے کے ساتھ جاری رہا۔ اس عشقِ رسولؐ کے بابرکت سفر کا آئینہ دار ان کا تازہ نعتیہ مجموعہ ''مدحت شاہِ

کونین'' ہے۔ نبی اکرمؐ سے نسبت بلاشبہ ہر مسلمان کے لئے قابلِ فخر بات ہے، اس نسبت کو اعزاز سمجھتے ہوئے اس کا شعری اظہار میرے نزدیک عبادت ہے۔ محمد امین ساجد سعیدی کے تازہ نعتیہ مجموعے کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے عبادت کا احساس ہوتا ہے۔ عقیدت میں گوندھے ہوئے الفاظ کمال مہارت سے نعت کے شعری پیکر میں ڈھالے گئے ہیں۔ ان نعتوں میں ایسا جادوئی ردھم ہے کہ بے ساختہ ترنم میں پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا، سرکار دو عالمؐ سے محبت تو ہر کلمہ گو کے دل میں موجزن ہے، سبھی مسلمانوں کا قیمتی اثاثہ ہے مگر اس محبت کا خوبصورت نعتیہ اظہار ہر کسی کے بس کی بات نہیں، سچ پوچھیں تو ہر کسی کا نصیب بھی نہیں ہوتا۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے

نعت گوئی بحضور رسول مقبول کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اسلام کی تاریخ ہے۔ حضور اکرمؐ کے صحابی حسان بن ثابتؓ سے لے کر بڑے جلیل القدر اولیاء اور درویش ہیں جن کے حصے میں یہ سعادت آئی۔ سعیدی صاحب کا نام پڑھتے ہوئے مجھے شیخ سعدی کی نعت بار بار یاد آتی ہے۔ ایک فارسی بولنے والا آدمی جس کی عربی زبان میں لکھی نعت جیسی کوئی اہل زبان بھی شاید نہیں لکھ پایا۔ یہ معجزہ خوش بختی ہے۔

مدحت شاہ کونینؐ میں محمد امین ساجد سعیدی نے جہاں اردو زبان کی روایتی نعت کہی وہاں کچھ نئے انداز بھی نظر آتے ہیں۔ نعتیہ ماہیے میں نے پہلی مرتبہ پڑھے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بے حد پسند بھی آئے ہیں۔ نعتیہ قطعات بھی کمال عشق کا پتہ دیتے ہیں اور خوبصورت طرز بیان

صاحب شق القمر محبوب رب یکتا ہیں آپ
محسنِ انسانیت ہیں دنیا و عقبیٰ ہیں آپ
منصبِ معراج سب نبیوں نے پایا فرش پر
عرش اعظم پر بنے مہمان جو تنہا ہیں آپ

اور یہ قطعہ تو مجھے بہت زیادہ پسند آیا، ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ کس خوبصورتی سے انہوں نے اپنا نام قطعہ میں استعمال کیا ہے۔

شافع روزِ جزا ہیں رحمۃ اللعالمین
بے کنار و بے بہا ہیں رحمۃ اللعالمین

بہترین ومہتریں ساجدامیں میرا یقین
ابتدا ہیں انتہا ہیں رحمتہ اللعالمین

عشق نبیؐ میں رچی بسی مدحت شاہ کونین کی اشاعت پر میں محمد امین ساجد سعیدی کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔امید کرتا ہوں کہ اعلیٰ ادبی اوصاف سے مزین نعت گوئی کا ان کا یہ سفر جاری رہے گا۔

کلام کروتا کہ پہچانے جاسکو،حضرت علیؓ کا یہ فرمان بڑا ہی پراز حکمت اور عالمی سچائی کا مظہر ہے۔بے شک انسان کی پہچان تبھی ممکن ہوتی ہے جب وہ کسی کسی طور پر اظہار خیال کرتا ہے۔اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے یوں تو کئی طریقے رائج ہیں مگر قرطاس وقلم کو سب سے زیادہ تکریم واعتبار حاصل ہے۔''گیان کے پھول'' میں فہیم ضیاء نے گیان دھیان کی باتیں کی ہیں،جس سے یہ کتاب واقعی علمی گلدستہ محسوس ہوتی ہے۔عقل وخرد کی باتیں مضامین کے پیرائے میں جس خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہیں وہ قابل تحسین انداز ہے۔موضوعات کا تنوع اس کتاب کو دلچسپ بناتا ہے اور حقیقی زندگی کا ترجمان بھی،چونکہ جیون بھی رنگا رنگ کے مضامین لئے ہوئے ہے۔زیست بھی یک رنگ نہیں ہے۔اس کتاب میں شامل بہت سارے مضامین اخباری کالموں کی صورت میں اردو روزناموں اور آن لائن اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ویسے تو اخباری کالموں کو ایک دن کا ادب کہا جاتا ہے مگر کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا جائے تو یہ ایک دن کا ادب مستقل ادبی تاریخ اور سخن وروں کے لئے محفوظ ادب کا حصہ بن جاتا ہے،جس سے سخن شناس ہمیشہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔سیاست دوراں سے لے کر حالت حاضرہ تک کون سا ایسا موضوع ہے جس پر فہیم ضیاء نے خامہ فرسائی نہ کی ہو،اعلیٰ ادب ذوق،بہترین تعلیم وتربیت اور تدریس کے شعبے سے تعلق کے سبب ہر موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔بعض تعزیت نامے پڑھ کر میں اداس ہو گیا،چونکہ ان احباب میں سے چند کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا،بلکہ دوستی اور قلبی لگاؤ تھا۔بالخصوص مظہر بخاری اور فرتاش سید تو میرے قریبی دوست تھے۔سیاست اور سماج پر تحریر کردہ مضامین سے آپ کا نظریاتی اختلاف ممکن ہوسکتا ہے مگر آپ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ مصنف کو سلیقے سے اپنی بات کہنے کا ڈھنگ

آتا ہے۔استدلال کا طور طریقہ بڑا دلکش ہے۔

اردو زبان میں خاکہ نگاری ایک خالصتاً ادبی موضوع سمجھا جاتا ہے۔فہیم ضیاء نے گیان کے پھول میں جو شخصی خاکے پیش کئے ہیں وہ ادب عالیہ کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی رنگ لئے ہوئے ہیں۔بہت خوبصورت اور رواں نثر کے بہترین نمونے ان مضامین کی زبن سلیس اور سادہ ہونے کے باوجود انتہائی دلکش ہے۔گیان کے پھول میں آپ کو ہر صفحے پر گیان کی باتیں بکھری ملیں گی،علم وحکمت اور دانش کے پھول کھلے ہوئے نظر آئیں گے مگر کبھی بھی خانہ پری محسوس نہیں ہوگی۔میں گیان کے پھول کی اشاعت پر فہیم ضیاء کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کی مزید ادبی وصحافتی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔

یکساں نصاب تعلیم ۔دوسرا رخ

حکومت نے ملک بھر میں یکساں نصاب تعلیم رائج کر دیا ہے۔تمام سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں اب ایک جیسی نصابی کتب پڑھائی جائیں گی۔انگریزی میڈیم اور اردو، مقامی زبانوں کے میڈیم اسکولوں میں یکساں درسی کتب ہوں گی، جو کہ حکومت سے منظور شدہ ہیں۔حکومت کے اس اقدام پر ایک طرف تو داد وتحسین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف شدید تنقید ہو رہی ہے۔ناقدین میں ایک گروہ وہ بھی ہے جو یکساں نصاب کا ناقد نہیں بلکہ جو نصاب حکومت نے پیش کیا ہے، وہ اس پر تنقید کر رہا ہے۔یکساں نصاب تعلیم کے حق میں سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ حکومت ایچی سن کالج، بیکن ہاؤس، گرامر سکول اور دیگر مہنگے نجی اداروں اور ٹاٹ والے، المعروف پیلے سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو اگر یکساں سہولیات اور ماحول مہیا نہیں بھی کر سکتی، پھر بھی کم از کم ایک جیسی کتابیں تو مہیا کر سکتی ہے؟ اگر معیار تعلیم ایک جیسا نہ بھی ہوگا پھر بھی نصاب تعلیم ایک ہونے سے سوچ اور فکر کا دھارا تو یکساں ہو سکتا ہے۔

یکساں نصاب تعلیم کے حکومتی اقدام پر تنقید کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ نظام دینی مدارس کے لئے بہترین ہے، اس طرح مذہبی مدرسوں کے طالب علم بھی وہی علم حاصل کر سکیں گے جو حکومتی اور نجی اسکولوں کے بچے حاصل کر رہے ہیں۔ناقدین کا کہنا ہے کہ انگریزی میڈیم اسکولوں کو یکساں نصاب کے نام پر زوال کی طرف مجبور کرنا انتہائی افسوس ناک اور قابل مذمت ہے۔

دونوں طرف سے اتنے مضبوط دلائل سن کر مجھے گاؤں کے ایک معزز شخص کا واقعہ یاد آ رہا ہے

جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی کو بھی ناراض نہیں کرتے۔کسی جھگڑے کے تصفیے کے سلسلے میں پنچائیت ثالثی کے لئے ان کے دولت کدے پر آئی۔دونوں متحارب فریق اپنا موقف ان کی خدمت میں اس طرح پیش کررہے تھے کہ فیصلہ انہی کے حق میں آئے۔پہلے فریق نے جب اپنا موقف پیش کیا تو منصف نے اس سے کہا کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔اس کے بعد فریق ثانی نے اپنا بیانیہ پیش کیا تو معزز ثالث نے اس سے بھی یہی کہا کہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شریف آدمی نے پنچائیت کے منصف سے کہا جناب عالی یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں متحارب فریق متضاد وقوعہ بیان کر رہے ہوں اور دونوں ہی ٹھیک ہوں؟اس پر مرنجان مرنج منصف نے کہا کہ کہہ تو آپ بھی بالکل ٹھیک رہے ہیں۔یکساں نصاب تعلیم کے متعلق یہ دو انتہائی متضاد نقطۂ نظر ہیں۔یہ بیک وقت دونوں درست نہیں ہوسکتے،یہ اپنی جگہ حقیقت ہے۔مگر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں چند دلائل ایسے ہیں جنہیں مکمل طور پر نظرانداز یا جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

اس معاملے میں بنیادی سوال تو یہ ہے کہ کیا تنوع بری چیز ہے؟ کیا انگریزی،عربی اور اردو و مقامی زبان میڈیم کی تفریق غلط ہے؟ ذریعہ تعلیم و نصاب تعلیم کی ملک بھر میں رنگارنگی اور تفاوت بچوں کے لئے مضر ہے؟اس تنوع کا نونہالوں کے ذہنوں اور شخصیت پر کیا منفی اثر پڑتا ہے؟اگر ان سوالوں کا جواب ہاں ہے تو پھر سب سے پہلے تو تمام نجی تعلیم ادارے اور دینی مدارس سرکاری تحویل میں لے لئے جائیں،چونکہ یکساں نصاب تعلیم اور میڈیم سے بھی زیادہ اہم یکساں ماحول ہے۔ایچی سن کالج اور ہمارے ایم سی سکول کا فرق فقط نصاب کا نہیں ہے۔بیکن ہاؤس اور خیرالمدارس کے بچے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ماحول پر تعلیم حاصل کررہے ہیں۔اگر حکومت خیرخواہی کا کوئی کام کرنا چاہتی ہے تو ان تمام اداروں کا ماحول بھی یکساں بنائے،جس کا طریقہ میں بیان کرچکا ہوں۔

یکساں نظام تعلیم کوئی نیا فلسفہ یا نظریہ نہیں،سوویت یونین میں یہ تجربہ ہو چکا،مشرقی یورپ اور تمام کیمونسٹ ممالک،جن کی ایک وقت میں تعداد ستر تک جا پہنچی تھی،ان سب میں یکساں نصاب تعلیم ہی تھا۔برطانیہ میں البتہ آکسفورڈ کا الگ نصاب اور کیمبرج کا اپنا تشکیل دیا ہوا نصاب رائج

ہے، دینی مدارس وہاں پر بھی اپنا مذہبی نصاب رکھتے ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں کے مدارس بھی قائم ہیں، عیسائیوں کے مشن اسکول اپنے طرز تعلیم پر چلتے آئے ہیں۔ جہاں تک قومی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بحث ہے تو امریکہ کے بے شمار سکولوں میں مکمل تعلیم ہسپانوی میں دی جاتی ہے، تمام مضامین ہی اسپینش میں پڑھائے جاتے ہیں اور ان گنت نصاب تعلیم ملک بھر میں رائج ہیں۔ کینیڈا میں ایسے علاقے بھی ہیں جس کے طالب علم فرانسیسی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ایسے طالب علم بھی ہیں جن کو شاید انگریزی کا ایک جملہ بھی نہیں آتا یا پھر آتا بھی ہے تو وہ بولنا پسند نہیں کرتے۔ مگر اس تفاوت سے نہ تو کینیڈا کی سالمیت کو کوئی خطرہ ہے اور نہ ہی امریکہ کی معیشت اور معاشرت تباہ ہونے جا رہی ہے۔

تعلیمی نصاب اور ذریعہ تعلیم سے زیادہ اہم بات تعلیم کا معیار ہے۔ تعلیمی اداروں کا ماحول زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ملک میں تعلیم کی شرح کیسے بڑھائی جائے؟ اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو شرح خواندگی بارہ فیصد تھی۔ گزشتہ ستر سال میں ہم نے بڑی کامیابی سے اسے ساٹھ فیصد تک پہنچایا۔ موجودہ حکومت کو اگر اس قوم کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی فکر ہے تو اسے چاہیئے کہ اس ساٹھ فیصد شرح خواندگی کو اوپر اٹھائے، اقوام متحدہ اور دیگر عالمی ادارے جو شرح خواندگی پر نظر رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان تین برسوں میں ہماری تعلیمی شرح بڑھنے کی بجائے نیچے کی طرف گئی ہے۔ کروڑوں بچے جن کی اسکول جانے کی عمر ہے وہ اسکول سے باہر ہیں، حکومت کو ان کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ یکساں تعلیمی نصاب کا سوال بعد میں آتا ہے، پہلے ان کروڑوں بچوں کو سکول میں داخل کرنے کا کوئی بندوبست ہونا چاہیئے۔

میری نظر میں تو دینی مدارس، انگریزی میڈیم اور سرکاری سکول تمام اپنی اپنی جگہ ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ یہ تنوع اور رنگارنگی وطن عزیز میں کثیر الجہتی اور وسیع المشربی پیدا کرنے کا سبب ہے، ان کی مثال گلشن میں کھلے ہوئے مختلف رنگوں کے پھولوں کی طرح ہے۔ یکساں نصاب و نظام نافذ کرنے کے پیچھے مجھے آمرانہ سوچ نظر آتی ہے۔ طالب علموں کی بھلائی سے زیادہ حکمرانوں کا اپنے اقتدار کی دھاک بٹھانے کا جذبہ نظر آ رہا ہے۔ حکومت اگر ملک و قوم سے خلوص کا ثبوت پیش کرنا چاہتی ہے تو شرح خواندگی بڑھا کر دکھائے جو کہ گراوٹ کا شکار ہے اور ان کروڑوں بچوں کو اسکول داخل کروانے کی بابت اقدام کرے جو اسکول نہیں جاتے مگر جن کی ابھی پڑھنے کی عمر ہے۔

روس یوکرین جنگ کا پس منظر

دو ہفتے قبل روس نے اپنے ہمسایہ ملک یوکرین میں اپنی فوج بھیج کر عالمی سیاست میں بھونچال پیدا کر دیا ہے۔ اسے اچانک حملہ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے سے یوکرین کی سرحد پر روس کی غیر معمولی فوجی نقل و حرکت کو عالمی میڈیا مسلسل نشر کئے جا رہا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ مسلح فوجی روس نے یوکرین کی سرحد پر تعینات رکھے تھے۔ جبکہ ہمسایہ ملک بیلا روس میں اس کی فوج یوکرین کی سرحد کے قریب مشترکہ فوجی مشقیں کر رہی تھی۔ مغربی ممالک اس اندیشے کا اظہار کر رہے تھے کہ روس کسی بھی وقت یوکرین پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ امریکہ اور یورپ کو جو خدشہ تھا بالآخر وہی ہوا اور روسی فوج نے سرحد عبور کر کے ایک کے بعد ایک یوکرینی شہروں پر قبضہ شروع کر دیا۔ روسی ٹینکوں اور مسلح گاڑیوں کا چالیس میل لمبا قافلہ اب دارلحکومت کیف سے تین کلومیٹر کی دوری پر پہنچ چکا ہے۔ جنگ کے دوران لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی صورتحال سے تو مقامی اور عالمی میڈیا آگاہ کر رہا ہے۔ بالخصوص کسی مغربی نیوز چینل پر تو کوئی دوسری خبر گزشتہ پندرہ دنوں میں بمشکل ہی نشر ہوئی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جنگ میں پہلی ہلاکت ہی سچائی کی ہوتی ہے اور صحافت کی جگہ ایسے موقع پر پروپیگنڈا لے لیتا ہے، بلاشبہ یہ اس وقت کی سب سے اہم خبر ہے۔ اس جنگ کی وجوہات جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس پس منظر کا جائزہ لیں جس سے اس سانحے نے جنم لیا۔

یہ 1991 میں کرسمس کا دن تھا جب سوویت یونین کا پرچم آخری مرتبہ کریملن میں لہرایا گیا۔ نئی نسل کو تو شاید اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اکتوبر 1917 کے بالشویک انقلاب کے نتیجے میں وجود

پانے والی اس نئی ریاست کی طاقت کیا تھی؟ یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم میں اسی سوویت یونین کی فوج نے ایڈولف ہٹلر کی نازی افواج کو شکست فاش دے کر برلن میں سرخ رنگ کا درانتی اور ہتھوڑے کے نشان والا اپنا یہی پرچم لہرایا تھا۔ ماسکو سے لے کر برلن تک راستے کے تمام یورپی ممالک اس کے سامنے سرنگوں تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں یہ وہ ملک تھا جس نے انسان کو عملی طور پر خلاؤں کی رفعتوں سے روشناس کرایا۔ یوری گاگرین وہ پہلا شخص تھا جو خلائی شٹل سپوتنک کے ذریعے زمین کی حدود سے باہر نکل کر خلا میں داخل ہوا تھا۔ سپوتنک ویسے بڑا رومانوی لفظ ہے، اس کا مطلب ساتھی، ہم نفس، دم ساز اور جیون ساتھی بھی ہوتا ہے۔ سپوتنک کی خالق اس ریاست کا جب شیرازہ بکھرا تو اس اشتراکی سلطنت سے پندرہ نئے ممالک نے جنم لیا جن میں سے ایک یوکرین بھی تھا۔ روس ان آزاد ممالک میں آبادی اور رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا جب کہ یوکرین دوسرے نمبر پر تھا، جس کی آج کل آبادی ساڑھے چار کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔

بیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے تو سوویت یونین کے قیام وخاتمے کے علاوہ دو عالمی جنگیں ہی سب سے اہم واقعات تسلیم کئے جاتے ہیں۔ گزشتہ صدی کا ذکر یونین آف دی سوویت سوشلسٹ ری پبلک کے بغیر ادھورا ہوگا۔ اسی ریاست کے بطن سے یوکرین نے جنم لیا ورنہ انسانی تاریخ میں کبھی اس نام اور جغرافیے کا ملک وجود نہیں رکھتا تھا۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اس کا موجودہ دارالحکومت کیف تین صدیوں تک روسی سلطنت کا دارالسلطنت تھا۔ یاد رہے کہ ماسکو شہر 1147 میں تعمیر ہوا تھا اور سینٹ پیٹرزبرگ جو سوویت دور میں لینن گراڈ کہلاتا تھا، روس کا پہلا یورپی طرز کا شہر ہے، وہ تو چند صدیاں قبل ہی پیٹر اول نے اپنے عہد میں تعمیر کروایا تھا اور اسی کے نام سے اب منسوب ہے۔ جبکہ کیف زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔

روسی اور یوکرینی تاریخی طور پر ایک ہی قوم ہیں۔ اگر الگ الگ بھی تسلیم کیا جائے تو ان کی تاریخ اس قدر پر پیچ اور آپس میں الجھی ہوئی ہے کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔ تاریخ میں یوکرین کا لفظ اور زمین تو وجود رکھتی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ آج کا آسٹریا، ہنگری اور پولینڈ کے

باشندوں کو بھی زمانہ قدیم میں یوکرینی کہا جاتا تھا۔ مجھے لیوٹالسٹائی کے ناول جنگ اور امن کا ایک حوالہ یاد آ گیا، اس ناول کو عالمی ادب میں ادبی تاریخ کے سب سے بڑے ناول ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ ٹالسٹائی نے دوصدیاں پہلے کے تناظر میں یہ ناول لکھا تھا، جس میں وہ گندم کی کٹائی کے لئے تذکرہ کرتا ہے، کہ کسان یوکرین سے مزدوری کے لئے آتے تھے اور روس میں گندم کاٹنے کے بعد واپس چلے جاتے، ہر سال یہ عمل دہرایا جاتا۔ ٹالسٹائی نے اس کتاب میں امن کی تعریف بھی کیا خوب کی ہے کہ یہ دو جنگوں کے درمیانی وقفے کا نام ہے، امن کی یہی جامع تعریف آج پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔

یوکرین کی جغرافیائی تاریخ کو اگر سادہ ترین انداز میں بیان کریں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے سرائیکی علاقے تو پاکستان کے تین صوبوں میں پائے جاتے ہیں مگر ایک سرائیکی ریاست یا صوبہ تاریخ میں کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ دوسری مثال کرد قوم یا مجوزہ کردستان کی ہوسکتی ہے۔ جدید یوکرین کا بانی اگر کیمونسٹ انقلاب کے معمار اور پہلے سوویت سربراہ ولادی میر لینن کو قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کریمیا کے جزیرہ نما اور مشرقی صوبوں کو اسی نے یوکرین کا حصہ قرار دیا تھا۔ روسی اور یوکرینی زبان کی مثال پنجابی اور سرائیکی کی سی ہے۔ اگر آپ کو ایک زبان پر عبور ہو تو دوسری زبان کو سمجھنے کے لئے مترجم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات میں یقین سے اس لئے بھی تحریر کر رہا ہوں چونکہ میں روسی زبان جانتا ہوں اور اسی سبب سے یوکرینی آسانی سے سمجھ لیتا ہوں۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد نوے کی دہائی میں روس اور یوکرین اپنے اپنے مسائل سے نبرد آزما رہے اور باہمی معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ اس صدی کی ابتدا روس میں ولادی میر پیوتن کے برسر اقتدار آنے کی خبر کے ساتھ ہوئی اور اسکے اقتدار سنبھالنے کے بعد نئے روس کی شبیہ ایک کمزور اور معاشی بدحالی کا شکار ملک سے تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ دوسری طرف یوکرین کی آبادی یورپی یونین میں شمولیت اور روسی کیمپ میں رہنے کی حمایت کی منقسم رائے میں بٹتی نظر آئی۔ کبھی روس نواز صدر منتخب ہو جاتا تو کبھی یورپ نواز سیاستکار عوام منتخب کر کے اقتدار اسے سونپ دیتی۔

مسئلہ تب کھڑا ہوا جب روس نواز صدر وکٹر یانوکوچ کے خلاف عوامی مظاہرے شروع ہوئے تو انہیں زبردستی اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔انہوں نے روس میں جا کر پناہ لے لی۔جلاوطنی کو دروان انہوں نے بتایا کہ یوکرین کی مسلح افواج نے ان پر فائرنگ کر دی تھی اور وہ صدارتی محل سے بمشکل جان بچا کر بھاگے ہیں۔دوسری جانب روس صدر پوتن کے اقتدار میں دوسری دہائی تک آتے آتے عسکری اعتبار سے بہت مضبوط اور معاشی اعتبار سے خوشحال ہو چکا تھا۔نیٹو افواج کی روسی سرحد کی جانب پیش قدمی کو وہ معاہدے کی خلاف ورزی قرار دیتا آیا ہے۔یاد رہے کہ سوویت یونین کے خاتمے کے وقت ⚐❄✌☠ نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ روسی سرحدوں کی جانب اپنا پھیلاؤ نہیں کریں گے۔پوتین دو دہائیوں سے مسلسل یورپ کو ان کا وعدہ یاد دلاتا آ رہا ہے مگر ایک کے بعد ایک سابق سوویت ریاست کو ⚐❄✌☠ اپنے عسکری اتحاد میں شامل کرتا آ رہا ہے۔یوکرین بھی اب اسی ڈگر پر رواں دواں تھا۔روس نواز صدر کی فوج کے ہاتھوں سبکدوشی کا جواب پوتین نے یوں دیا کہ پہلے کریمیا کے جزیرہ نما پر اپنی فوج بھیجی اور عوامی ریفرنڈم کے بعد اسے روس میں ضم کر لیا۔وکٹر یانوکوچ جس روسی نژاد اکثریت کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے،وہاں کے لوگوں نے کیف کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی،یہ یوکرین کا سب سے بڑا ریجن دونیسک کہلاتا ہے۔اس کے ہمسایہ علاقے نے بھی مسلح بغاوت کر کے کیف سے آزاد لوہانسک ریاست کا اعلان کر دیا۔روسی نژاد اکثریت رکھنے والے اس دنباس کے علاقے میں مزاحمت یا بغاوت کو ماسکو کی حمایت حاصل ہو گئی۔عارضی جنگ بندی لائن قائم ہو گئی۔مگر مسلح جدوجہد کرنے والے روس نوازوں کو گزشتہ آٹھ سال سے یوکرینی فوج کی جانب سے مزاحمت کا سامنا رہا۔روسی میڈیا کے مطابق 🗐🗁🗀🗎 سے اب تک چودہ ہزار افراد یوکرینی فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔مقامی لوگ عرصہ دراز سے روس کو مدد کے لئے پکار رہے تھے۔بالآخر وہ دن آ گیا اور صدر پوتین نے ان علاقوں کو آزاد ممالک تسلیم کر کے ان کی مدد کے لئے فوج بھیج دی۔اب معاملہ مگر مشرقی یوکرین تک نہیں رہا،بات آگے بڑھ گئی ہے۔روسی زبان وثقافت سے آشنائی کے سبب بہت ساری باتیں ہیں جو میں اہلِ روس کے بارے میں جانتا ہوں،جن سے عمومی پاکستانی ناآشنا ہیں۔اس بنیاد پر میں فقط یہی کہوں گا کہ یہ تنازعہ جلدی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

روس یوکرین جنگ کا ایک سال

روس اور یوکرین کے درمیان عسکری تنازعے کو ایک سال مکمل ہو گیا ہے۔ جنگ کہنے میں تامل اس لئے ہے کہ روسی حکومت اسے اب تک آپریشن قرار دے رہی ہے۔ نام اس کشاکش کو کوئی بھی دے دیں، بہرحال ہے تو یہ جنگ ہی، جس کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ میڈیا اور منڈی پر کنٹرول کے سبب مغرب کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ یورپ کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو پوری دنیا کا مسئلہ قرار دے دیتا ہے، جبکہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں وقوع پذیر ہونے والے بڑے سے بڑے سانحات وحادثات توجہ کے طالب ہی رہ جاتے ہیں۔ یوکرین چونکہ یورپ میں واقع ہے اس لئے یہ پوری انسانیت کا مسئلہ قرار پایا ہے۔ محاذ جنگ سے آنے والی خبروں کا انحصار ہمارا مغربی میڈیا پر ہی ہے۔ اس کی وجہ قابل فہم بھی ہے کہ پاکستانیوں کی روسی زبان تک رسائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزید برآں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ پر بھی چونکہ مغرب کا کنٹرول ہے، اس لئے روس کا موقف نشر کرنے پر پابندی ہے۔ مجھے چونکہ روسی زبان پر دسترس حاصل ہے اور روس کے بہت سارے احباب بھی مسلسل رابطے میں رہتے ہیں، اس لئے جنگ کے متعلق ان کا موقف بھی جاننے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اس تنازعے کے متعلق سمجھنے کی جو سب سے بنیادی بات ہے، وہ یہ کہ گزشتہ برس کے روسی حملے سے جنگ کی ابتداء نہیں ہوئی بلکہ 2014 میں یہ تنازعہ شروع ہوا۔

یوکرین کے منتخب صدر کو احتجاجی ہنگاموں کے بعد فوج نے زبردستی اقتدار سے سبکدوش کر دیا۔ روس نواز کہلانے والے منتخب صدر وکٹر یانوکوچ اپنے صدارتی محل میں بیٹھے تھے جب فوج نے

وہاں گولی چلائی۔ جان بچا کر وہ ماسکو جا پہنچے اور وہیں سے ان کے اقتدار کے خاتمے کی خبر آئی۔فوج کی سرپرستی میں معاملات آگے بڑھے مگر روسی حکومت کے لئے یہ کڑوی گولی نگلنا مشکل تھا۔اس یورپ نوازی کا جواب صدر پوتین نے 2014 میں ہی یوکرین کے جزیرہ نما کریمیا پر قبضے کی صورت میں دیا۔اس کے ساتھ ہی روسی اکثریتی آبادی والے مشرقی حصے نے بھی بغاوت کردی اور روس میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کردیا۔یاد رہے کہ تاریخی طور پر کریمیا اور یوکرین کے مشرقی حصے ''دنباس'' اور ''لوہانسک'' روس کا حصے رہے ہیں۔سوویت یونین کے دور میں صدر ولادی میر لینن اور اسٹالن نے انہیں یوکرین کا حصہ بنایا تھا۔اس کا مقصد سوویت یونین کی مضبوطی تھا۔حالانکہ وہاں رہنے والوں کی اکثریت ہمیشہ ہی روسی نژاد رہی ہے۔تاریخی حقیقت تو یہ بھی ہے کہ یوکرین 1992 سے پہلے تاریخ میں کبھی بھی کوئی ملک نہیں رہا۔یوکرین کا دارلحکومت کیئو صدیوں تک روس کا دارلحکومت رہا ہے۔اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے کیئو روس کہا جاتا تھا اور یہی ریاست کا نام تھا۔ماسکو تو 1147 میں تعمیر ہوا تھا اور سینٹ پیٹرز برگ تو ابھی کل کی بات ہے، جب پیٹر اول کو خیال آیا کہ یورپی طرز کا ایک شہر تعمیر کیا جائے۔روس اور یوکرین کو تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے سے الگ کرنا بڑا مشکل ہے۔برصغیر پاک و ہند میں تو مذہب وہ بنیاد فراہم کر رہا تھا جس پر الگ ریاست تعمیر کی جا سکے مگر روس اور یوکرین میں تو دونوں طرف آرتھوڈوکس عیسائی ہیں۔پولینڈ کی سرحد کے قریب رہنے والے یوکرینی یورپ میں شامل ہونے کے متمنی ہیں اور روس کی سرحد کے ساتھ آباد لوگ خود کو روس کے ساتھ بہتر محسوس کرتے ہیں۔

جنگ کا ایک سال مکمل ہونے پر صدر پوتین کا دو گھنٹے پر محیط خطاب میں نے بڑے انہماک سے سنا۔اس میری توجہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روسی صدر میڈیا سے بہت ہی کم بات کرتے ہیں۔بعض اوقات تو پورا مہینہ گزر جاتا ہے اور صدر پوتین کے منہ سے نکلی کوئی بات میڈیا میں نشر نہیں ہوتی ہے۔تقریر تو بلاشبہ وہ مہینوں کے وقفوں سے ہی عمومی طور پر کرتے ہیں۔ان کے بقول جنگ کی ابتداء یوکرین نے 2014 میں اس وقت کی تھی، جب روس نواز منتخب صدر یانوکوچ کو فوج نے مداخلت کر کے

اقتدار سے زبردستی نکالا تھا۔خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ اپنے تاریخی خطاب میں صدر ولادی میر پوتین نے پاکستان کا بطور خاص ذکر کیا اور مستقبل میں دوطرفہ تجارت کے امکانات پر گفتگو خطاب کا حصہ بنی۔

روسی جنگجو قوم ہیں۔جنگ سے بالکل بھی نہیں گھبراتے۔دنیا کا سب سے بڑا رقبہ اور سب سے زیادہ قدرتی وسائل رکھنے کے سبب اس سرزمین کی حفاظت ہی ان کے نزدیک سب سے معتبر اور اہم کام ہے۔ہر مرد کے لئے دوسالہ فوج کی نوکری ضروری ہے، اگر وہ بیمار ہیں یا پھر کسی پروفیشنل ڈگری میں تعلیمی اعتبار سے مشغول ہے۔تب استثنیٰ مل جاتا ہے۔اس جنگ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ روس اور یوکرین دونوں ہی کرائے کی فوج بھی استعمال کر رہے ہیں۔روسی پرائیویٹ میلیشیا کو ''ویگنر'' جبکہ یوکرینی ''موزارٹ'' کہلاتی ہے۔یاد رہے کہ ویگنر اور موزارٹ دونوں ہی جرمن موسیقار تھے، دونوں ہی کمال کے فنکار تھے، میں ذاتی طور پر دونوں کا معترف ہوں۔یوکرین کو میڈیا مظلوم اور اچھا بچہ کے طور پر پیش کر رہا ہے۔اس متعلق صرف دو باتیں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔پہلی یہ کہ ہٹلر سے متاثر، نسل پرست اور سفید رنگ کے لوگوں کو اشرف اور برتر جاننے والے نوجوانوں کی عسکری تنظیم یوکرین میں ''آزوف بٹالین'' کہلاتی تھی۔سفید فام برتری کے قائل یہ لوگ ہم جیسے ''رنگین'' لوگوں کو گھٹیا اور کمتر خیال کرتے ہیں، مار پیٹ بھی کرتے ہیں۔یوکرین کی فوج نے اس نسلی منافرت پھیلانے والی تنظیم کو باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا اور یہ کوئی جنگ کے ہنگام نہیں ہوا، بلکہ جنگ سے دو برس پہلے ہی AZOF بٹالین فوج کا حصہ بن گئی۔دوسری چیز جس نے میرا یوکرینی حکومت سے دل کھٹا کر کر دیا وہ جنگ کی ابتداء کے دنوں میں انخلا کے وقت منظر عام پر آنے والی پاکستانی، انڈین، افریقی نژاد لوگوں کی ویڈیوز تھی۔سرکاری ملازمین ٹرین اور بس میں سوار ہونے کے لئے بننے والی قطار میں سے چن چن کر گندمی اور سیاہ فام لوگوں کو باہر نکال رہے تھے کہ آپ سوار نہیں ہو سکتے۔مائیکروفون سے سرکاری اہلکار اعلان فرما رہے تھے کہ صرف سفید فام لوگ ہی گاڑی میں سوار ہونے کے اہل ہیں۔روس میں ایسی حرکت کا تصور بھی محال ہے۔

ممکن ہے کچھ قارئین کو یہ تحریر روس کے موقف کی تائید محسوس ہو۔میں اس بات سے انکار بھی نہیں کرتا مگر اس کی وجہ ذاتی پسند نہیں بلکہ قومی ہے۔پہلی بات اس بابت یہ ہے کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد دنیا میں طاقت کا توازن مکمل طور پر امریکہ اور یورپی بلاک کے حق میں چلا گیا۔یہ یک قطبی دنیا پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کے لئے بری خبر ثابت ہوئی۔چین کی حیرت انگیز ترقی اور روس کی انگڑائی سے یہ تزویراتی توازن دوبارہ پیدا ہوتا دکھائی دے رہا ہے،کثیر قطبی دنیا کے قیام کا امکان ہم جیسے ممالک کے لئے اچھا شگون ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ روسی عوام نسلی تعصب نہیں رکھتے ہیں۔بطور پاکستانی وہ ہمیں اپنے برابر کا انسان تسلیم کرتے ہیں اور اسی طرح برابری کا برتاؤ کرتے ہیں۔یورپ کے باقی ممالک میں بسنے والی اقوام کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔شاید یہ سوویت یونین کی 75 سالہ تربیت کا اثر ہے کہ روس کے لوگ نہ تو کسی سے دبتے ہیں اور نہ ہی کبھی کسی کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔امیر غریب،افسر ماتحت،سفید رنگین،مرد وزن ایک خاص طرح کی برابری کا تاثر دیتے ہیں۔مغربی میڈیا ہمیشہ آزادی اظہار کا درس دیتا ہے۔نشریاتی بندشوں کے خلاف ہمیشہ مغربی میڈیا کو سراپا احتجاج دیکھا ہے مگر کبھی کسی برطانوی یا امریکی جریدے میں آج تک میں نے روس کے بارے میں مثبت اور اچھا کوئی ایک لفظ بھی نہیں پڑھا ہے۔نیویارک ٹائمز اس وقت میرے سامنے پڑا ہے اور روس سے متعلق خبروں کے باتصویر صفحے کی شہ سرخی ملاحظہ فرمائیے''تمام روسی یہ چاہتے ہیں کہ یوکرینی عوام سردی سے مرجائیں''تبصرہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

مختلف جرائم میں ملوث پابند سلاسل افراد پر مشتمل یونٹ محاذ جنگ پر بھیجنا روسی روایت رہی ہے۔''شتراف باٹ'' جسے اردو میں جرمانہ بٹالین کہہ سکتے ہیں،ہراول دستے کے طور پر لڑتی آئی ہے۔اس بٹالین کے آگے دشمن اور اس کا علاقہ ہوتا ہے جبکہ پیچھے روسی فوج پیش قدمی کر رہی ہوتی ہے۔یعنی آگے اور پیچھے سے گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔جنگ میں فتح کی صورت میں اس بٹالین میں شامل مجرمان کی سزائیں معاف کردی جاتی ہیں۔یوکرین اور مغرب''شتراف باٹ'' پر شدید تنقید کر رہا ہے مگر جنگ میں بھلا کونسا قانون اور اخلاقیات کا پاس ولحاظ۔میرا خیال ہے کہ یہ جنگ ابھی لمبا عرصہ چلے گی۔جنگ کے خاتمے کا امکان اس لئے کم ہے کہ NATO اسلحہ اور پیسہ بے دریغ یوکرین بھیج رہا ہے،روس بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔اس تناظر میں مجھے یہ ایک نئی سرد جنگ کا آغاز لگ رہا ہے۔

پری گوژن اور قلبِ عالم کا نظریہ

کسی دانا کا قول ہے کہ جنگ میں جس چیز کی سب سے پہلے موت ہوتی ہے وہ سچائی ہے۔ حالانکہ ہماری دنیا نے خیرہ کن حد تک ترقی کی ہے اور انتہائی تیزی کے ساتھ تہذیب کے ارتقاء کا سفر بھی طے کیا ہے، مگر جب بات جنگ کے حوالے سے ہو تو پھر پہلی شکست آج بھی سچ کی ہی ہوتی ہے، جنگی ماحول میں خبروں کی جگہ پروپیگنڈا لے لیتا ہے۔ اب آپ روس اور یوکرین کے مابین تنازعہ ہی دیکھ لیں، یقین مانیں اچھے خاصے معتبر نشریاتی ادارے جن کی نہ صرف مغرب میں اچھی ساکھ اور طویل تاریخ ہے بلکہ تمام دنیا میں ان کا نام اعتماد کے ساتھ لیا جاتا ہے، ان دنوں انہی نشریاتی اداروں کی نشریات دیکھیں اور اخبار پڑھیں تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا، کہ ایسی غیر ذمہ داری اور غلط بیانی کا ارتکاب ان جیسے ناموراور اعتبار کے قابل ادارے کیسے کر سکتے ہیں؟ شاید ہمارے سمجھنے میں فرق ہے؟ پھر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جنگ میں سچ اور حقائق سے زیادہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے دھڑے کی حمایت کرنا زیادہ قابل تحسین عمل سمجھا جاتا ہے، چاہے مشرق ہو یا پھر مغرب۔ پورا سچ لکھنے اور بولنے پر ہو سکتا ہے مغربی دنیا میں پابندی نہ ہو، مگر میڈیا کے لوگ اور مالکان خود بخود لگتا ہے کم از کم اس جنگ کے موضوع پر تو سچ بولنے پر تیار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ یقین مانیں اس جنگ کی پاکستان میں مغرب کی نسبت بہتر اور زیادہ معیاری کوریج ہوئی ہے۔

تیسرے سال میں داخل ہونے والی اس جنگ میں ایک کردار بڑا ابھر کر سامنے آیا اور وہ تھا پریگوژن۔ روس میں ایک تاریخ رہی ہے کہ جیل میں پابند سلاسل قیدیوں کو جنگ کے ہنگام یہ موقع

دیا جاتا ہے کہ اگر وہ مادرِ وطن کے لئے محاذ جنگ پر جا کر لڑنا چاہیں تو اس کی نا صرف اجازت ہے، بلکہ جنگ کے خاتمے پر دادِ شجاعت دینے والے تمام اسیران کی سزائیں بھی معاف کر دی جاتی ہیں۔سزا یافتہ قیدیوں پر مشتمل ایسے ہی ایک گروپ کا سربراہ تھا ایفگانی پریگوژن، جس میں پچاس ہزار مسلح افراد شامل تھے۔روس کی طرف سے رضا کارانہ لڑنے والے اس مسلح گروہ کو ''ویگنر'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔کئی محاذوں پر مردانہ وار لڑنے اور فتوحات دلانے والے اس جنگی کمانڈر کی موت مشکوک حالات میں ایک فضائی حادثہ میں ہوئی ہے۔سال بھر عالمی میڈیا کا مرکز نگاہ رہنے والے اس شخص کا پس منظر بڑا ہی دلچسپ ہے۔عمومی شہرت اس جنگی کمانڈر کی صدر پوتین کے باورچی کے طور پر ہوئی۔تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، بس اتنا ذکر کر دوں کہ بچپن اور لڑکپن میں چھوٹی موٹی چوری، چکاری کے الزام میں متعدد بار جیل کاٹنے کے بعد پریگوژن کی زندگی میں مثبت تبدیلی آئی، اس نے ایک ریستوران کھول لیا جو کہ اتفاق سے چل بھی نکلا۔اس پر دو آتشہ یہ ہوا کہ صدر ولادی میر پوتین ایک دفعہ اس ریستوران میں کھانا کھانے آیا تو اس کو یہاں کا کھانا پسند آ گیا۔یہ تذکرہ کرتا چلوں کہ صدر پوتین اور پریگوژن کا تعلق ایک ہی شہر، سینٹ پیٹرز برگ سے ہے۔صدارتی محل میں دعوتوں کے لئے پریگوژن سے کھانا منگوایا جانے لگا، آہستہ آہستہ ریڈاسکوائر، جو کہ ماسکو شہر میں روسی صدر کی رہائش گاہ اور دفتر ہے، وہاں ہونے والی تمام دعوتوں کا انتظام وانصرام پریگوژن کے سپرد ہو گیا۔اس کی وجہ صرف کھانے کا معیار نہیں تھا، بلکہ صدر پوتین کا پریگوژن پر اعتماد اور اعتبار بھی تھا۔اسی اعتماد کی بنیاد پر اسے رضا کار نجی میلشیا کا سربراہ بنا کر جنگ کی ابتداء میں ہی رضا کار جنگجو بھرتی کرنے کی اجازت دے دی گئی۔اس مسلح نجی میلشیا کی بھرتی کے بنیادی مرکز جیل خانہ جات تھے، قیدیوں کو جنگ کے اختتام پر آزادی اور نیک چلن کے اعزاز کے علاوہ باقاعدہ تنخواہ بھی دی جاتی ہے، جو کہ پاکستانی روپے میں بات کریں تو اچھی خاصی رقم بنتی ہے۔

عالمی منظر نامے پر پریگوژن اس وقت زیادہ ابھر کر سامنے آیا جب اس نے اپنی نجی میلشیا کی مدد سے یوکرین کی فوج کو باخموت کے محاذ پر شکست دے کر شہر پر روسی پرچم لہرا دیا، جنگ کے دوران بھی

اس کی بنائی ہوئی ویڈیوز عالمی نشریاتی اداروں کی خبروں کا موضوع اس لئے بنیں چونکہ وہ اپنے وزیر دفاع، آرمی کے سربراہ اور دیگر حکومتی اہلکاروں پر تنقید کرتا تھا، جو کہ خاصی شدید ہوتی تھی، جس کا روس میں رواج عمومی طور پر نہیں ہے۔ باخموت شہر فتح کرنے کے بعد اس کی تنقید میں شدت آ گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے پچاس ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ہمراہ ماسکو کی طرف مارچ کرنے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اس نے صدر پوتین کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ مغربی میڈیا نے کئی دن تک روس میں خانہ جنگی کی ابتداء کے عنوان سے خبریں چلائیں۔ پریگوژن کو ہیرو بنا کر پیش کیا جانے لگا، جو چند دن پہلے تک اسی میڈیا کی خبروں کے مطابق ولن اور شیطان صفت تھا۔ ماحول میں حدت بڑھی تو بیلا روس کے تاحیات صدر لوکاشنکو نے بیچ بچاؤ کروایا اور معاہدہ طے پا گیا، جس کی رو سے پریگوژن بیلا روس منتقل ہو گیا۔ یہاں سے کہانی کا نیا موڑ ہے، ایک روسی گاہک جو گاڑیاں خریدنے جاپان آیا ہوا تھا، وہ میرے دوست کے ساتھ بیٹھا خبریں دیکھ رہا تھا، جب یہ معاہدہ اور اس کی تفصیلات ٹیلی ویژن پر بیان کی جا رہی تھیں، روسی گاہک میرے دوست سے کہنے لگا کہ پریگوژن ایک مہینہ زندہ رہے گا، زیادہ سے زیادہ دو مہینے، تین مہینے نہیں گزار سکتا، کسی سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے گا، کسی ہوائی حادثے میں مارا جائے گا۔ ہو سکتا ہے دل کا دورہ پڑ جائے۔ حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس تاریخی معاہدے کے ٹھیک تیس دن بعد پریگوژن کے ایک ہوائی حادثے میں مارے جانے کی خبر دنیا بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اپنے دوست سے میں نے از راہ تفنن کہا کہ اس روسی کی زبان کالی ہے۔ سچ مگر یہ ہے کہ وہ اپنے ملک اور اس کے نظام کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اب یہ بھی سوال ابھرتا ہے کہ اگر سب لوگ نظام کو سمجھتے ہیں تو پھر ایسے واقعات کیوں بار بار ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ روسی قوم کی نفسیات ہے۔ آپ کو شائد یہ مبالغہ لگے مگر روسی کبھی کسی سے بھی دبتے نہیں ہیں، نہ کسی کو نیچے لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی خود کسی کے نیچے لگتے ہیں۔ اگر کسی بہت ہی کمزور روسی کی بڑے پہلوان سے لڑائی ہو جائے تو یاد رکھیے گا، پہلا تھپڑ روسی مارے گا، اپنی کمزوری کے باوجود، اس کے بعد چاہے پہلوان اور تگڑا فریق اس کا مار مار کر بھرکس ہی نکال دے۔

ایک پڑھے لکھے روسی سے میں نے جنگ کے موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے صدر پوتین پر کچھ تنقید کر دی، اس کے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے طریقہ کار کو ہدف تنقید بنایا اور وہ تمام الزامات جو مغربی میڈیا اس پر لگاتا ہے، وہ دہرا دیئے۔ جواب میں روسی دوست نے کہا کہ جناب! ہمیں ایسے ہی صدر کی ضرورت ہے۔ ہمارا ملک بہت بڑا اور تزویراتی اعتبار سے انتہائی اہم ہے، اس لئے ہمیں مضبوط قیادت ہی درکار ہے۔ مجھ سے کہنے لگا کہ تمہیں ہارٹ لینڈ تھیوری کے بارے میں پتا ہے؟ میں نے گول مول جواب دیا تو اس نے تفصیل سے سمجھایا کہ اس نظریے کے بانی کا دعویٰ یہ ہے کہ عالمی سیاست میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ ملکوں کا جغرافیہ اور حدود اربعہ ہے۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والے ہالفرڈ میکنڈر نے اس نظریے کو ترتیب دینے کے بعد 1904 میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا۔ وہ ایک ایسا سیاسی جغرافیہ دان تھا جس کے پیش کردہ اس ''جیوپالیٹکس'' پر مبنی نظریے کو ایک دوسرے کے شدید مخالف، جرمنی کے ہٹلر اور روس کے صدر اسٹالن دونوں ہی مانتے تھے۔ اس نظریے کے مطابق سائبریا، سنٹرل ایشیا اور یورپ کے کچھ حصے دنیا کا دل ہیں، جو دنیا کے جغرافیائی اعتبار سے دل پر حکومت کرے گا، وہی پوری دنیا کا حکمران بن جائے گا۔ دنیا کے دل پر حکمرانی اب کسی کمزور دل یا نرم دل والے آدمی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ روسیوں نے صدر پوتین کو اگلے چھ سال صدارت کے لئے پھر منتخب کر لیا ہے۔

میاں میرؒ کا عرس اور حساس تقرری

شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں مدفون مغل شہزادے داراشکوہ کی پرورش مستقبل کے بادشاہ کے طور پر کی گئی تھی۔شاہ جہاں نے کم سنی میں ہی اسے ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔مغلیہ سلطنت تو قائم رہی مگر تصوف اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والا یہ نفیس شہزادہ کبھی ہندوستان کا حکمران نہیں بن پایا۔لاہور سے اسے خاص الفت تھی۔وہ اس شہر میں حضرت میاں میرؒ کے کاشانے سے خصوصی لگاؤ اور عقیدت رکھتا تھا۔ایک دن داراشکوہ جو کہ شاعر بھی تھا،اس نے حضرت بابا میاں میرؒ سے یہ سوال پوچھا

گر من منم،خلاف من چرا؟
گر من نیستم،چہ تقصیر ماست؟

جبر وقدر کے تاریخی مسئلے کے بارے میں انسان کی مجبوری اور مختاری کا سوال داراشکوہ نے بالکل ایک نئے انداز میں صوفی بزرگ کے سامنے پیش کیا تھا۔یعنی اگر میں بااختیار ہوں تو میرے گردوپیش ظہور پذیر ہونے والے واقعات،میرے جسم کے اندر بے شمار عوامل میری مرضی اور منشاء کے بغیر اور خلاف کیوں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔مثال کے طور پر ہم اپنی سانس روکنا چاہیں تو چند سیکنڈ،منٹ سے زیادہ نہیں روک پاتے ہیں،دل کی دھڑکن ہمارے بس میں نہیں۔نہ تو اپنے جسم پر ہمارا پورا کنٹرول ہے اور نہ ہی ہمارے حالات ہماری مرضی کے تابع ہیں۔اگر میں خودمختار ہوں تو یہ سب کچھ میری خواہش کے خلاف کیوں وقوع پذیر ہو رہا ہے؟

بصورت دیگر،اگر میں مجبور محض ہوں،میرا کوئی اختیار ہی نہیں ہے،کوئی ہستی اور حیثیت ہی

نہیں میری، سب لوح ازل پر لکھ دیا گیا ہے، میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا، تو پھر روز محشر حساب کس چیز کا ہوگا؟ میری لغزشوں پر پکڑ کرنے کا کیا جواز ہے؟ میری غلطی کیا ہے؟ میں کیسے مجرم ٹھہرایا جاسکتا ہوں اگر میں تقدیر کے جبر کے سامنے مجبور محض ہوں؟

حضرت میاں میرؒ نے جو جواب دیا شائد وہ بہت سے دوستوں کو پسند نہ آئے، فرمایا! حلوہ ایک اچھی غذا ہے مگر شیر خوار بچے کے لئے مضر ہے۔ انؒ کے نزدیک شائد داراشکوہ اس اسرار کو جاننے کے لئے ذہنی طور پر ابھی پختہ و تیار نہیں تھا۔ کچھ تربیت ابھی باقی تھی۔ تصوف اور راہ سلوک میں غالباً اس کی مثال ابھی شیر خوار بچے کی سی تھی۔ جو سوال اس نے کیا تھا، شائد اس کا درست جواب ہضم کرنے کی اس میں سکت ابھی نہیں تھی۔ حالانکہ داراشکوہ کی حضرت بابا میاں میرؒ سے عقیدت کا عالم یہ تھا کہ ان کے مزار کی تعمیر کے لئے وہ سرخ پتھر لاہور منگوایا جو کہ اب بادشاہی مسجد میں لگا ہوا ہے۔ جس سگے بھائی اورنگزیب عالمگیر نے تخت کے حصول کے لئے داراشکوہ جیسے بھائی کو قتل کروادیا وہ بھلا اس مرنے والے کی خواہشات اور عقیدتوں کا احترام کیسے کرسکتا تھا۔ اسی لئے بادشاہی مسجد لاہور میں وہ پتھر لگوادیا گیا۔ ویسے تو امرتسر کے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد بھی سکھ گرو کی خواہش پر سائیں میاں میرؒ نے ہی رکھی تھی جو کہ سکھوں کا سب سے مقدس استھان ہے مگر اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔

راہ سلوک کے مسافروں اور عسکری موضوعات کا براہ راست تعلق تو زیادہ نہیں بنتا، مگر جتنے دنوں سے فوج کے نئے ڈی جی آئی ایس آئی کی تقرری کا موضوع میڈیا میں زیر بحث ہے، مجھے میاں میرؒ کا مغل ولی عہد داراشکوہ کو دیا گیا جواب بار بار یاد آ رہا ہے۔ کہ ہر بات ہر شخص کے لئے نہیں ہوتی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اس بار حضرت میاں میرؒ کے سالانہ عرس اور عساکر میں مذکورہ تقرریوں اور تبادلوں کا وقت چونکہ ایک ہے۔ خدا کے ولی کی حکمت سے بھرپور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بات کرتے ہوئے مخاطب کا ہاضمہ اور جذب کی قوت کا بھی خیال رکھنا چاہئیے، جب حساس موضوعات پر بات کی جائے۔ ایک خالصتاً فوج کا اندرونی معاملہ عوامی گفتگو اور ذرائع ابلاغ کے تجزیوں تبصروں کا موضوع نہیں بننا چاہئیے تھا۔ حکومت نے اس حساس تقرری اور تبادلے کو جس غیر

سنجیدگی سے طے کرنے کی کوشش کی ہے وہ کسی طور پر بھی پاکستان کے حق میں نہیں ہے۔کوئی ایک بھی روشن پہلواس حکومتی طرزعمل کے نتیجے میں اس معاملے میں نظرنہیں آیا۔یہ کہنا بالکل بھی درست نہیں ہے کہ اس افسوسناک صورتحال میں میڈیا کا کوئی قصوراور کردار ہے۔مین اسٹریم میڈیا نے تو بہت دیر بعد اس موضوع پر بات کرنا شروع کی ہے،اس حساس معاملے کوعوامی بحث کا موضوع تو خود حکومت نے بنایا ہے، جوکہ بالکل غلط طرزعمل ہے۔

غلط فہمیوں کا تدارک

میرا امریکی دوست ٹام آج کل اپنی سولہ سالہ بیٹی کے ہمراہ پاکستان کی سیر وسیاحت کر رہا ہے۔ ذرا مذہبی ذہن کا آدمی ہے اور عیسائیوں کے مورمن فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مورمن مسلک کو عیسائیوں میں وہی مقام حاصل ہے جو جماعت احمدیہ کا مسلمانوں میں ہے۔ ایران میں بہائی فرقے کے لوگ مورمن مسلک سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔ ٹام کے مسلکی اور مذہبی نظریات کا تذکرہ اس لیے کر رہا ہوں کہ مورمن لوگ عمومی طور پر مہم جو پسندی میں مبتلا ہی ملتے ہیں۔ یہ صلیب کا نشان اپنے گرجا گھروں یا ذاتی طور پر کسی بھی جگہ استعمال نہیں کرتے۔ ان کا مذہبی نشان حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا خاکہ ہے۔ ''کتابِ مورمن'' کو مقدس صحیفہ خیال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بائیبل کی سچائی کی گواہی دیتی ہے، ان کے مطابق یہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ نصرانیوں کے دیگر مسالک ان کے ایمان کو مشکوک سمجھتے ہیں، بلکہ یوں کہیئے کہ انہیں عیسائی ہی تسلیم نہیں کرتے ہیں، سابق امریکی صدارتی امیدوار مٹ رومنی اسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ویسے یہ انگریز بھی بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ گزشتہ ماہ ٹام کی نوکری چھوٹ گئی۔ جس کمپنی میں وہ بطور اکاؤنٹنٹ کئی سال سے کام کر رہا تھا، اس نے کام سے جواب دے دیا ہے۔ کرونا وبا کے دنوں میں گھر بیٹھ کر کام کرنے کا رواج ہوا تو وہ اپنی جاپانی بیوی اور بیٹی کے ساتھ جاپان آ گیا۔ نوکری اس کی امریکی ریاست یوٹاہ میں تھی۔ یوٹاہ کا ذکر آیا ہے تو بتاتا چلوں کہ اس ریاست سے تعلق رکھنے والا اگر کوئی شخص آپ کو ملے تو غالب امکان یہی ہے کہ وہ مورمن فرقے سے منسلک ہوگا۔ اسی طرح

اگر کبھی کوئی مورمن آپ کو ملے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ اس کا سالٹ لیک سٹی یا یوٹاہ ریاست ہی کے کسی علاقے سے تعلق ہوگا۔میرے دوست ٹام کی نوکری چھوٹی تو اس نے فیصلہ کیا کہ یہ بہترین موقع ہے سیاحت اور دنیا گھومنے کے لئے۔

ادھر ادھر سے اس نے سیاحتی معلومات اکٹھی کرنا شروع کر دیں۔نظرِ انتخاب بہرحال ہمارے وطن پاک پر ہی ٹھہری۔روانگی سے قبل بارہا اس کے ساتھ اس مجوزہ سفر پر تبادلہ خیال ہوا۔بہت سارے خدشات ٹام کے ذہن میں اس ایڈونچر کے بارے میں موجود تھے۔فیصلہ مگر وہ حتمی کر چکا تھا کہ

پاکستان میں جاواں ای جاواں

سچ تو یہ ہے کہ ٹام کوہ پیمائی کا شوقین ہے۔دنیا کی بلندترین پہاڑی چوٹیوں میں سے کئی پاکستان میں ہیں۔بالخصوص کے ٹو جو کہ ماؤنٹ ایورسٹ کے بعد اس عالم رنگ و بو میں سب سے بلند پہاڑی چوٹی ہے،اور پھر کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کا ہی نانگا پربت،جس کا لفظی مطلب تو ننگا پہاڑ ہے مگر انگریز اسے کلر ماؤنٹین یعنی قاتل پہاڑی کہہ کر پکارتے ہیں۔نانگا پربت گلگت بلتستان میں واقع ہے اور دنیا کی دس بلندترین پہاڑی چوٹیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔پہلی مرتبہ 1953 میں آسٹریا کے ایک اشک نازی یہودی کوہ پیما ہرمین بھول نے اسے سر کیا تھا۔کے ٹو پہاڑ کو مشکل و خطرناک موسمی صورتحال اور ترچھی ڈھلوانوں پر بلند شرح اموات کے سبب ''وحشی پہاڑ'' کہا جاتا ہے۔ناسا کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ کے ٹو پر شرح اموات 29% ہے،جبکہ ماؤنٹ ایورسٹ پر کوہ پیمائی کرنے والے افراد میں یہ شرح فقط 4% ہے۔شاید انہی وجوہات کی بنا پر میرے دوست ٹام نے کے ٹو پہاڑ کے بیس کیمپ تک ہی جانے کا فیصلہ کیا ہے۔اسے چڑھنے اور سر کرنے کا ارادہ نہیں باندھا۔یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ کے ٹو پہاڑ کا نام انیسویں صدی میں ایک برطانوی سروے کے نتائج پر مبنی و ماخوذ ہے۔کے ٹو میں K قراقرم رینج کا مخفف ہے اور 2 کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی ہے۔

اسلام آباد پہنچنے کے بعد ٹام سکردو پہنچا اور اب کے ٹو کے بیس کیمپ کی طرف

رواں دواں ہے، مجھے کے ٹو کے پہاڑ کی تصویر کھینچ کر اس کے ساتھ ایک برقی پیغام بھیجا ہے، کہ وہ پاکستانیوں کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا ہے۔ کہتا ہے آپ کا خوبصورت دیس ہے اور دلدار لوگ ہیں یہاں کے رہنے والے۔ ٹام کا کہنا ہے کہ پاکستان کو دنیا نے صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے۔ وہ حیران ہے کہ ایسے خوبصورت ملک اور اچھے لوگوں پر مبنی ریاست کا دنیا میں امیج منفی کیوں ہے؟ اس کے مطابق پاکستانیوں جیسے دوستانہ مزاج اور مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار لوگ اس عالم رنگ و بو میں کم کم ہی پائے جاتے ہیں، ٹام کا کہنا ہے کہ میں تو پاکستان میں جس سے بھی ملا ہوں وہ بہت محبت اور اپنائیت سے ملا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پاکستان کی اصل اور خوبصورت تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کوئی مسئلہ درپیش ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے دوست کے اس تجزیے سے حرف بہ حرف اتفاق کرتا ہوں۔ میرے خیال میں عالمی سطح پر پاکستان کا امیج خراب ہونے کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں، اس امیج کو بہتر بنانے کی ذمہ داری بہر حال ہماری ہے۔ اس بابت ایک تو ہمارے سفارتخانے اپنا قومی فرض ادا کریں اور اپنے متعلقہ ممالک کے میڈیا میں پاکستان کا مؤقف زیادہ جاندار طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ میری تجویز ہے کہ پریس سیکرٹری کا عہدہ کسی بیوروکریٹ کی بجائے صحافیوں اور میڈیا کی سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد کو دینا چاہیئے۔ اگر میرٹ پر پریس سیکرٹری تمام سفارت خانوں میں صحافت اور میڈیا کا عملی تجربہ رکھنے والے افراد تعینات کر دیئے جائیں تو کرشمہ ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ بیرون ملک سفارتی عملہ تعینات کرتے وقت ان ملازمین کو ترجیح دینی چاہیئے جو متعلقہ ملک کی زبان جانتے ہوں۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا چلوں کہ پاکستان میں جاپان کے سفارتی عملے میں کم از کم آدھے جاپانی اردو زبان جانتے ہیں۔ لیکن جاپان میں تعینات پاکستانی سفارتی عملے کا شاید ایک رکن بھی جاپانی زبان نہیں بول سکتا ہے۔ دوسری درخواست میری پچاسی لاکھ بیرون ملک بسنے والے پاکستانیوں سے ہے کہ وہ خود کو پاکستان کا سفیر سمجھیں اور جس ملک میں بھی مقیم ہیں وہاں پاکستان کا امیج بہتر بنانے کی کوشش قومی فریضہ سمجھ کر کرتے رہیں۔

سفرنامے کا ارتقاء اور لندن

اردو زبان میں سفرنامہ نگاری کا آغاز مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفؔر کے برطانیہ بھجوائے گئے سفیر نواب کریم خان کے ''سیاحت نامہ'' سے ہوتا ہے۔نواب کریم خان مغل سفیر کی حیثیت سے سن 1839 میں لندن پہنچے اور چند برس وہاں قیام کیا۔ ہمارے بعض دانشوروں کا اس بابت اصرار ہے کہ اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش کا تاریخِ یوسفی وعجائبات فرنگ ہے۔اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ یہ سفرنامہ سن 1847 میں شائع ہوا ہے مگر مصنف نے انگلستان کا یہ سفر مغل سفارتکار سے چند برس قبل یعنی سن 1836 میں اختیار کیا اور اسی دوران یہ رودادِ سفر بھی تحریر فرمادی تھی، لہٰذا تاریخی اعتبار سے اسے ہی پہلا سفرنامہ کہیں گے۔اس بابت ایک اور بڑا نام سرسید احمد خان کا آتا ہے ۔سرسید احمد خان نے جہاں برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اہمیت اجاگر کرنے اور علی گڑھ یونیورسٹی جیسے تعلیمی ادارے قائم کر کے مسلمانانِ ہند کی بے پناہ خدمت سرانجام دی ہے، وہاں انہوں نے اپنی قوم کو جدید دنیا سے متعارف کروانے کا بیڑا بھی اٹھا رکھا تھا۔اسی سلسلے میں ان کی کاوش برطانیہ کا سفرنامہ ''مسافرانِ لندن'' بھی ہے، جو کہ پہلے علی گڑھ کے گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔انگلستان میں 1869 کے دنوں میں کیا حالات تھے، اس بات کا اپنے سترہ ماہ کے قیام کے دوران انہوں نے بڑی محنت سے مشاہدہ اور تجزیہ کیا۔تمام تر تعصّبات سے بالاتر ہو کر برطانیہ کے سماج، ثقافت اور معیشت کو گہرائی میں سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کی، وہاں کی درس گاہوں کا تفصیلی تذکرہ انہوں نے خطوط کی صورت میں بیان کیا تھا۔اس تمہیدی تفصیل بیان کرنے کا

مقصد یہ ہے کہ اردو زبان میں سفرنامہ نگاری کی ابتداء برطانیہ اور بالخصوص لندن کے سفرناموں سے ہوئی ہے۔اسی حوالے سے ایک نئی معیاری کتاب میری نظر سے گزری ہے ۔فقیراللہ خان کا تازہ سفرنامہ ''یہ ہے لندن'' اس درخشندہ روایت میں ایک خوبصورت اضافہ ہے اور ارتقائی عمل کا غماز بھی ہے۔

جذبات کا شاعرانہ بیان اس سفرنامے کا خاصہ ہے۔زبان سلیس اور سہل ہونے کے ساتھ ساتھ طرز تحریر انتہائی دلچسپ ہے۔یہ بات بیان کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سفرنامہ آجکل کے عمومی سفرناموں کے برعکس بے حد معلوماتی ہے۔اگرچہ دنیا کے معتبر ادیب اور تنقید نگار سفرنامے کو فکشن قرار دیتے ہیں مگر پھر بھی سفرنامہ ناول یا پھر افسانہ نہیں ہوتا ہے۔اردو سفرناموں کے مصنفین اگر خود پر بہتان لگانے پر تلے ہوئے ہوں اور ناکردہ گناہوں کا سزاوار خود کو قرار دینے پر راضی ہوں تو مجھے بھی ان پر کوئی خاص اعتراض تو نہیں ہے،مگر کیا ہی اچھا ہوا گر وہ احباب قرطاس وقلم تھوڑی بہت معلومات ان منزلوں اور مقامات کے متعلق بھی پیش کر دیا کریں جہاں کا سفرنامہ وہ تحریر کر رہے ہوتے ہیں۔''یہ ہے لندن'' اس لحاظ سے منفرد سفرنامہ ہے کہ اس میں معلومات کا دریا بہتا ہے۔شہر کے تمام اہم گلی ،کوچوں اور چوک، چوراہوں کا بیان اس تفصیل سے آپ نے پہلے شائد ہی کبھی پڑھا ہوگا۔تاریخ اور حال کا ایسا خوبصورت امتزاج میں نے تو کم از کم بہت ہی کم کتابوں میں بیان ہوتے پڑھا ہے۔منظر کشی لاجواب ہے۔ہماری قوم میں جن لوگوں کے پاس سفر کرنے کی استطاعت اور وسائل ہوتے ہیں،ان کے پاس عمومی طور پر قلم نہیں ہوتا ہے اور جو اہلِ قلم ہیں ان کے پاس دنیا گھومنے کے عام طور پر وسائل نہیں ہوتے ہیں۔یہ فقیراللہ خان صاحب کی خوش بختی ہے کہ مالک کائنات نے انہیں مادی وسائل سے بھی مالا مال کر رکھا ہے اور وہ قلم قبیلے کا بھی حصہ ہیں۔میں تو اسے قارئین کی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ انہیں ''یہ ہے لندن'' جیسا سفرنامہ پڑھنے کا موقع میسر آیا ہے۔اس میں نا صرف عہدِ حاضر کی جھلک اور آج کے حالات کا بیان ہے بلکہ ڈیڑھ ،دو صدیاں پیشتر سفرنامہ نگاری کی جس روایت کا آغاز کیا گیا تھا،اس روایت کی پاسداری اور ارتقاء بھی

نظر آتا ہے۔عہدِ حاضر کے ممتاز سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ سے میں نے سوال کیا کہ کیا سفرنامہ ادب کا حصہ ہے؟ان کا جواب بڑا دلچسپ تھا، کہنے لگے کہ اگر قراۃ العین حیدر دھوبی کا حساب بھی لکھے گی تو وہ بھی ادب کا حصہ شمار ہوگا۔سفرنامہ ادب کا حصہ ہے یا نہیں ہے،اس کا انحصار لکھنے والے پر ہے۔عرض کرنے کا مقصد ہے کہ ادب کا حصہ شمار ہونے یا پھر ادب سے خارج ہونے کا دارومدار اور فیصلہ لکھنے والے کی تحریر کا معیار طے کرتا ہے۔فقیر اللہ خاں کا ''یہ ہے لندن'' پڑھ کر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ادب کا حصہ اور ایک علمی روایت کا خوبصورت ارتقاء ہے۔جاذبِ نظر رنگین سرورق اور معیاری جلد کے ساتھ اس کتاب کو نستعلیق مطبوعات نے لاہور سے شائع کیا ہے۔عمدہ چھپائی اور آفسٹ کاغذ پر 224 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مہنگائی کے اس دور میں یہ قیمت زیادہ محسوس نہیں ہوتی ہے۔

سرسید احمد خان کے سفرنامے ''مسافران لندن'' اور ''یہ ہے لندن'' میں مجھے جس مشترکہ خوبی نے متاثر کیا وہ تعلیمی اداروں کا تفصیلی بیان اور طرز تدریس کو موضوع بنانا ہے۔فقیر اللہ خاں نے کتاب کا پورا ایک باب تعلیمی اداروں کے تعارف اور ان سے متعلق گفتگو کے لئے مختص کیا ہے جس میں ٹاپ ٹین اداروں کا تذکرہ ہے۔امپریل کالج (IC) یونیورسٹی کالج لندن (UCL) لندن سکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس یونیورسٹی (LSE) کنگز کالج لندن (KCL) کوئین میری یونیورسٹی آف لندن، سٹی یونیورسٹی لندن، برک بیک یونیورسٹی لندن، برونل یونیورسٹی لندن، کنگسٹن یونیورسٹی لندن (KUL) ایس او اے ایس یونیورسٹی (SOAS)۔ان تدریسی اداروں کے علاوہ اخبارات وجرائد کا بڑی تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے، بی بی سی لندن پر ایک الگ باب باندھا گیا ہے۔سفرنامے کے مذکورہ بالا حصے کو تعلیم کی روشنی کے مینار کا نام دیا گیا ہے۔ایک حصہ میوزیم اور دیگر دو حصے باغات واہم پلوں کے متعلق ہیں۔

اس دنیا میں جس شہر کو سب سے پہلے عروس البلاد کا نام دیا گیا وہ لندن تھا۔یہ ایک ایسی سلطنت کی راجدھانی رہا جس کا سارے جہاں میں طوطی بولتا تھا، جس کی حکومت کے زیر اثر علاقوں کی

وسعت اس قدر زیادہ تھی کہ کبھی اس سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔بعض بذلہ سنج دوست سرد موسم کے تناظر میں اب یہ پھبتی کستے ہیں کہ جس سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا،آج کل وہاں سورج طلوع ہی نہیں ہوتا ہے۔برطانیہ کے حکمرانوں نے لندن میں بیٹھ کر شرق وغرب کے ممالک پر حکمرانی کی،اسی وجہ سے لندن شہر تاج وتخت کے وارثوں کا میزبان بنا۔مصنف کا کہنا ہے کہ یہ میزبانی کسی نہ کسی صورت اب بھی لندن کے حصے میں آتی ہے۔دنیا کے کئی ممالک کی حکومتیں جب ڈگمگانے لگتی ہیں تو ان کے حکمرانوں کو لندن ہی پناہ دیتا آرہا ہے۔یوں اس شہر کا دامن بہت وسیع ہے۔دریائے ٹیمز کے کنارے واقع لندن شہر ہر صورت اپنی خوبصورتی میں بے مثال ہے۔اس شہر کے بے مثال حسن میں دریائے ٹیمز کا کلیدی کردار ہے۔بکنگھم پیلس ہو یا ہاؤس آف پارلیمنٹ،بگ بینگ ٹاور ہو یا لندن برج،عہدِ حاضر میں تعمیر کیا گیا میلینیم ڈوم ہو یا لندن آئی،یہ سب ٹیمز کے کنارے واقع ہیں۔یہ دریا لندن کے گلے کا ہار ہے ،جو طرح طرح کے خوبصورت اور چمکدار موتیوں سے مزین ہے۔دو ہزار سال پیشتر بسائے گئے اس شہر کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ گزشتہ ایک ہزار برس میں کبھی کوئی غیر ملکی فوج اس میں داخل نہیں ہو سکی۔اس عالم رنگ وبو میں جس شہر کے سب سے زیادہ سفرنامے لکھے گئے ہیں وہ بلاشبہ لندن ہی ہے،''یہ ہے لندن''اس قدیم روایت میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

آنے والے سنہرے ایام کے نام

چند ماہ کی تاخیر سے سہی مگر پاکستان میں عام انتخابات کا انعقاد بالآخر ہوگیا۔ دیر آید، درست آید۔ تسلی بخش بات یہ ہوئی کہ عمومی فضا پورے ملک میں پرامن رہی۔ انتخابات کے دوران امن وامان کا قیام ہمارے ملک میں کوئی آسان ہدف نہیں ہے۔ نتائج کا اعلان آپ دیکھ، سن اور پڑھ چکے ہیں، اس لئے میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ صرف اس کے چند پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ عام انتخابات 2024 کا سب سے نمایاں پہلو تو کسی بھی ایک جماعت کو وفاق میں سادہ اکثریت کا نہ ملنا ہے۔ میرے خیال میں تمام سیاسی جماعتوں اور مبصرین کو عوام کے اس فیصلے کا احترام کرنا چاہیئے کہ جنہوں نے تمام جماعتوں کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ مل جل کر حکومت سازی کی عادت ڈالیں۔ سیاسی مخالفت کوئی قبائلی دشمنی نہیں ہوتی۔

جہاں تک دھاندلی کے الزامات کا تعلق ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ ہارنے والا امیدوار اور جماعت نتائج ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں سدا سے یہی ہوتا آیا ہے کہ انتخابات کے دوران ایک امیدوار جیت جاتا ہے جبکہ دوسرے کے ساتھ دھاندلی ہوتی ہے۔ ہارتا کوئی بھی نہیں ہے۔ کم از کم میری یاداشت میں تو کوئی ایک انتخاب بھی ایسا نہیں جس کے نتائج کو تسلیم کر لیا گیا ہو۔ انتخابی شکست کو کھلے دل سے مان لینا کم از کم ہماری سیاسی روایت تو نہیں بن سکی ہے۔ گزشتہ مرتبہ سلیکٹڈ، سلیکٹڈ، اس سے پچھلے عام انتخابات کے نتائج پر آر او الیکشن کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس مرتبہ بھی ہم اپنی روایات کے مطابق انتخابی نتائج پر اپنے شکوک اور تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں، تو یہ کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہے، یہ پرانی خبر ہے۔ اچھی بات انتخابی نتائج کی یہ ہے کہ ملک کی تینوں بڑی سیاسی جماعتوں کو ایک ایک صوبے میں اکثریت ملی ہے، جس کی بنیاد پر وہ وہاں حکومت قائم کرنے جا رہی ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو

سندھ میں واضح مینڈیٹ ملا ہے۔تحریک انصاف KP میں غالب رہی جبکہ پنجاب کے لوگوں نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ نواز پر اپنے اعتماد کا ظہار کیا ہے۔کیا ہی اچھا ہوا گر یہ جماعتیں آپس میں بہتر کارکردگی کا مقابلہ اور موازنہ کیا کریں۔اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد اب صوبائی حکومتوں کے پاس وسائل کی کوئی کمی باقی نہیں رہی ہے۔یہ شکوہ بھی کوئی صوبہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ اس کو وسائل کا جائز حصہ نہیں مل سکا۔یہ وقت سیاسی مباحثے اور الزام تراشیوں سے نکل کر اب عوام کی خدمت کرنے کا ہے۔اور تمام سیاسی جماعتوں کا مرکز نگاہ اب عوامی فلاح ہونا چاہیے۔

بلوچستان میں ایک خوشگوار تبدیلی یہ آئی ہے کہ ماضی کے برعکس اس مرتبہ وفاقی سیاسی جماعتیں غالب رہی ہیں۔ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے کہ بلوچستان میں علاقائی،صوبائی اور نسلی بنیادوں پر قائم جماعتوں کے علاوہ آزاد ارکان کی اکثریت ہوتی ہے۔اس مرتبہ مگر پہلے،دوسرے،تیسرے نمبر پر یہاں بھی قومی سیاسی جماعتوں کے نمائندے فاتح نظر آئے ہیں،جو کہ ایک اچھا شگون ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ وہاں قومی سطح پر وفاق کی سیاست کرنے والی جماعتیں مضبوط ہونے سے پاکستان مضبوط ہوگا۔یہ سیاسی جماعتوں کا فرض بنتا ہے کہ زیادہ پسماندہ اور محروم علاقوں کے نمائندوں کو حکومت سازی کے عمل میں شامل کریں اور ان کو حکومت کا حصہ بنائیں تا کہ ترقی سے محروم علاقے احساس بیگانگی کا شکار نہ ہوں۔جہاں تک بلوچستان میں عسکریت پسندوں کا تعلق ہے تو ان کے ساتھ ویسے ہی نمٹنا چاہیئے جیسے پوری دنیا میں دہشت گردوں کے ساتھ نمٹا جاتا ہے۔بندوق اٹھا کر اور جتھے بنا کر اپنی بات منوانے کا طرز عمل دنیا بھر میں نا قابل قبول ہے جس کی حوصلہ افزائی کسی طور پر بھی ریاست کے مفاد میں نہیں ہے۔

پاکستان کو بہت بڑے بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔سب سے بڑا اور اہم مسئلہ معیشت ہے۔معاشی استحکام کے لئے دن رات ایک کرنے کی ضرورت ہے۔پاکستانی قوم اور اس دھرتی میں صلاحیت و وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال اس قوم کو درست سمت کی ضرورت ہے۔اس سمت کی درستگی میں سب سے پہلی معاشی سمت کی درستگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے مفاد میں تمام سیاسی جماعتوں کو اکٹھا ہونا چاہیئے اور وفاق میں ایک وسیع البنیاد قومی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔میثاق جمہوریت کے ثمرات جس طرح ہم پاکستان میں مسلسل عوامی حکومتوں اور انتخابات کے تسلسل کی صورت میں سمیٹ رہے ہیں،حالانکہ یہ دو سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔اسی طرز پر ہی معیشت پر بھی ایک سمجھوتہ

ہونا چاہیئے ۔ میثاق معیشت ایک خوبصورت خیال ہے، اسے نعرہ سے زیادہ ایک عملی صورت دینے کا وقت اب آ گیا ہے۔کوئی بھی حکومت بنے اور ٹوٹے مگر معاشی منصوبہ بندی ایسی طرز پر کرنے کا عہد کرلیں جو پاکستان کو ترقی کی جانب لے جانے کی ضامن ہو سکے اور مستقل چلتی رہے۔

ہندوستان کا معاشی سفر ہم سے زیادہ مختلف نہیں ہے مگر گزشتہ دو دہائیوں سے ان کی معاشی پالیسی مستقل رہی ہے۔ڈاکٹر منموہن سنگھ اور نریندر مودی کے سیاسی عقائد اور شخصیت میں زمین و آسمان جیسا فرق ہے۔ایک سیکولر سوچ کا حامی ترقی پسند معیشت دان جو کانگرس کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔اور دس سال حکومت کی، تو دوسرا بالکل الٹ یعنی

ہندوتوا کا پیروکار اور پرچارک جو مساجد کی جگہ مندر بنانے کے وعدوں پر ووٹ لیتا ہے۔ایک بات پر مگر اس مودی نے منموہن سنگھ سے اتفاق کیا اور وہ اس کی معاشی پالیسی تھی۔ ہمارے معیشت دان اور معاشی پالیسی بنانے والے حضرات یقیناً جانتے ہوں گے کہ دو دہائیاں پہلے جس ہندوستان کے محفوظ ذخائر زرمبادلہ دو ارب ڈالر تھے۔آج اس کے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر چھے سو ارب ڈالر سے تجاوز کر چکے ہیں۔ یہ ہمارے لئے لمحۂ فکریہ بھی ہے اور خود احتسابی کا موقع بھی ہے۔ایک پہلو اس منظر نامے کا یہ بھی ہے کہ ہمارے ایک طرف چین اور دوسری طرف بھارت اگر معاشی طور پر ترقی کر رہے ہیں تو یقیناً ہماری ترقی میں بھی کوئی قدرتی رکاوٹ تو نہیں ہے۔مربوط معاشی پالیسی اور اس پر مستقل مزاجی سے عمل کر کے ہم یقیناً دنیا کی بڑی معیشت اور ترقی یافتہ ملک بن سکتے ہیں۔ پاکستان کی سرزمین قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اور پاکستانی قوم انتہائی باصلاحیت ہے، اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ اچھی حکمت عملی جس پر عمل کرنے کے لئے قابل افراد پر مشتمل مستحکم حکومت۔نئی حکومت کے قیام کے موقع پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ہمارے ملک و قوم کو سرخرو کرے گی۔ترقی کی آرزو فقط ہماری خواہش ہی نہیں بطور شہری ہمارا حق ہے۔

حصہ سوم

یادِ یاران

محبت کا فلسفی شاعر رخصت ہوا

کبھی گمان میں بھی نہ تھا کہ موت ایسے زندہ آدمی کو بھی ہم سے چھین کر لے جائے گی۔محبت کی نظمیں کہنے والے امجد اسلام امجد اب ہم میں نہیں رہے۔یہ خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری ہے۔ابھی چند دن پہلے انہیں مسجد نبوی کے صحن میں سبز گنبد کے پاس نبی اکرمؐ کی نعتیں سناتے دیکھا گیا۔زندگی اور خلوص سے بھری مسکراہٹ والے امجد اسلام امجد جس محبت کا پرچار اپنے شعر و سخن میں کرتے تھے خود بھی اس چاہت و خلوص کا پیہم اور عملی نمونہ تھے۔ان کی شخصیت کے کئی رنگ اور پہلو تھے۔مگر ہر رنگ سے محبت چھلکتی اور ہر جہت پیار کا پیغام دیتی تھی۔ان سے عقیدت کے ساتھ ساتھ دوستی کا بھی قریبی رشتہ تھا۔میری دعوت پر جاپان تشریف لائے اور اس دورے کی یادوں کو انہوں نے سفر نامے کی صورت ''آج کا جاپان'' کے نام سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔بارہا میاں چنوں میرے گھر پر قیام کیا۔متعدد بار مشاعروں میں شریک ہوئے۔جب جب جہاں جہاں انہیں میں نے مدعو کیا ہمیشہ عزت بخشی۔اس تذکرے کا مقصد یہ امر واضح کرنا ہے کہ مجھے گزشتہ ربع صدی کی اس دوستی کے تعلق میں ان کی صحبت میں کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔یہ بلاشبہ ایک خوش قسمتی تو ہے،اس کے ساتھ ساتھ اس عہد ساز شاعر،ادیب،ڈرامہ نگار،کالم نویس،محقق،مترجم،سفر نامہ نگار،معلم اور اعلیٰ اخلاقیات حامل شخصیت کے انسانی پہلوؤں کا قریب سے جائزہ لینے کا بھی بھرپور موقع تھا۔امجد اسلام امجد جتنے بڑے تخلیق کار تھے اتنے ہی بڑے انسان اور انسان دوست تھے۔

ان کی پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی۔تہلکہ خیز اس لئے کہوں گا کہ یہ کتاب نظموں کی

تھی۔روایت کی بات کی جائے تو اردو شاعری میں نو واردان اپنے شوق کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔غزل ہمارے مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد موسیقی پر ہے۔قافیہ اور ردیف میوزک پیدا کرتے ہیں۔امجد اسلام امجؔد کا روایت سے انحراف بغاوت نہیں تھی، چوکہ وہ بہت خوبصورت غزل کہتے تھے، احمد ندیم قاسمی اپنے ادبی پرچے ''فنون'' کے لئے ان سے فرمائش کر کے غزل منگواتے اور اہتمام سے شائع کرتے تھے۔امجد اسلام امجؔد کے الفاظ میں مکمل نظموں کی کتاب سے فنی سفر کا آغاز بڑا رسک تھا۔مگر چونکہ وہ فنکار بڑے تھے۔اس لئے انہیں اپنے فن پر اعتبار تھا، ان کی پہلی کتاب ''برزخ'' تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔شعر وسخن کے قارئین نے اسے بے حد پسند کیا۔اس سے پہلے یہ ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر کرکٹر تھے۔اور پاکستان کی قومی ٹیم کا حصہ بننا چاہتے تھے۔اپنے کالج اسلامیہ سول لائنز کی کرکٹ ٹیم میں ان کی حیثیت سپر سٹار کی تھی۔سلیکشن کا وقت آیا تو کوئی سفارشی ان کی جگہ سلیکٹ ہوگیا۔سخت آزردہ خاطر ہوئے۔بلا توڑ دیا۔کبھی کرکٹ نہ کھیلنے کا خود سے عہد کیا۔یہ سوچ کر کہ اس ملک میں سفارش کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ایک انٹرویو میں مجھے بتانے لگے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مجھ پر بڑی رحمت ہوئی تھی۔پوچھنے لگے کہ ہمارے دور میں ایک بڑے اچھے ٹیسٹ کرکٹر گزرے ہیں ممتاز احمد مگر کیا آپ نے ان کا نام بھی سنا ہے؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کرکٹر کا کیریئر بہت مختصر ہوتا ہے۔مگر ادیب اور شاعر تو مرنے کے بعد بھی زندہ وجاوید رہتے ہیں۔

ان کے اپنے الفاظ میں پاکستان بننے میں ابھی تین سال اور دس دن باقی تھے (4 اگست 1947) جب لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں ان کی پیدائش ہوئی۔دستکار گھرانہ تھا، میں اس کو روایتی مذہبی خاندان کہنا چاہوں گا۔ان کے والد سے میری متعدد بار ملاقات ہوئی۔بڑے درویش صفت انسان تھے۔امجد اسلام امجؔد کو میں سعادت مند بیٹا لکھنا چاہوں گا، اپنے والدین کی انہوں نے بڑی خدمت کی تھی۔پڑھائی میں بڑے لائق تھے۔ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔اس دوران تخلیقی کام پر مکمل توجہ رہی۔

اگر یہ کہا جائے کہ امجد اسلام امجد پیدائشی ادیب اور شاعر تھے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ وہ روزاول سے حرفوں کے آدمی تھے۔شعروسخن ان کے خون میں رچے بسے ہوئے تھے۔سال 1975 میں سات سالہ تدریسی فرائض ایم اے او کالج میں ادا کرنے کے بعد، ایک اہم موڑ پنجاب آرٹس کونسل میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر متعین ہونا تھا۔ثقافتی ادارے میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے سبب انہیں تخلیق کے لئے موزوں ماحول دستیاب رہا۔اس تخلیقی فضا کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔یہ اسی زمانے کا ذکر ہے جب ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''وارث'' پی ٹی وی پر نشر ہوا۔نوجوان نسل کو تو شائد اندازہ ہی نہ ہو کہ اس ڈرامے کی مقبولیت کس سطح پر تھی۔شہروں اور گاؤں کی سڑکیں آٹھ بجے رات سب سنسان ہو جایا کرتی تھیں۔جس روز اس کی قسط ٹی وی پر نشر ہوتی تھی۔ پی ٹی وی کو ٹی وی اس لئے لکھا ہے کہ ان دنوں صرف یہی واحد ٹیلی ویژن چینل ہوا کرتا تھا۔ایک بزرگ نے امجد اسلام امجد کے ہاتھ چومے تو وہ ذرا گھبرائے۔اس پر باریش شخص نے کہا کہ میں ان ہاتھوں کو چوم رہا ہوں جنہوں نے ''وارث'' ڈرامہ، خدا کے فضل سے تخلیق کیا ہے۔اس کے بعد'' دن'' اور فشار بھی انتہائی مقبول ہوئے۔یا نصیب کلینک کے علاوہ بھی بے شمار ڈراموں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔مگر'' وارث'' نے شہرت دوام پائی۔حال ہی میں چین کے قومی ٹی وی چینل پر اسے چینی سب ٹائیٹل کے ساتھ بھی نشر کیا گیا۔

حکومت کی جانب سے ان کی خدمات کے اعتراف میں پرائڈ آف پرفارمنس جسے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی کہتے ہیں 1987 میں انہیں دیا گیا اور 1998 میں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔بیسٹ فلم رائٹر کا نگار ایوارڈ دو مرتبہ انہیں ملا۔جبکہ پی ٹی وی اور دیگر چینلز سے بے شمار ایوارڈ وصول کیے۔چند سال پہلے ترکی کے سب سے اعلیٰ ادبی انعام نجیب فاضل ایوارڈ انہیں ترک صدر رجب طیب اردگان کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔وہ پہلے پاکستانی تھے جنہیں اس اعزاز سے نوازا گیا۔درجنوں شعروسخن کی معیاری کتابوں، بے شمار ڈراموں، ہزاروں خوبصورت کالموں اور نونہالان وطن کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا صلہ اور اصل ایوارڈ تو لوگوں کی ان سے والہانہ محبت ہے۔ایسی

تکریم واحترام اس پاک سرزمین پر جنم لینے والے کم کم لوگوں کے حصے میں ہی آتا ہے جوان کا مقدر بنا۔ پاکستانی قوم کی ایک خوبی مجھے بے حد پسند ہے کہ کبھی کسی غلط آدمی کی عزت نہیں کرتے۔

امجد اسلام امجدؔ بنیادی طور پر گھریلو قسم کے آدمی تھے۔ گھر گرہستی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اپنی بیگم فردوس امجد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ شہروں شہروں ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود بھی ان کا دھیان گھر کی جانب ہی لگا رہتا۔ اپنی اولاد سے تو سب کو محبت ہوتی ہے۔ مگر ہم شاعروں میں عمومی طور پر ہر ایک لاپرواہی اور کسی حد تک بے نیازی اس باب میں روا رکھی جاتی ہے۔ امجد اسلام امجد مگر اس بارے میں بڑے ذمہ دار باپ تھے۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی زندگی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ہمہ وقت اس بابت دھیان رکھتے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو بطور مترجم بڑا اہم ہے۔ غیر ملکی شاعری سے ہم وطنوں کو روشناس کروانے کے لئے انہوں نے دیس دیس کی شاعری کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔ جدید عربی نظموں کے تراجم ''عکس'' کے نام سے شائع ہوئے اور افریقی شعراء کی نظمیں ''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' کے نام سے۔

وہ بڑے خوش قسمت تخلیق کار تھے کہ انہیں زندگی میں بے پناہ محبت اور توجہ ملی۔ بلاشبہ اس عزت وشہرت کے حق دار بھی تھے۔ کیا خوبصورت زندگی گزار گئے کہ زمانے سے انہیں کوئی شکوہ نا تھا اور نہ ہی زمانے کو ان سے کوئی شکایت۔ بلکہ دوطرفہ محبت کا معاملہ رہا۔ جس کا ثبوت ملک بھر کی سوگوار فضا ہے۔ ہماری خوبصورت روایات میں سے ایک قابل تحسین روایت جانے والے کے متعلق صرف مثبت بات اور تذکرے کی ہے، سچی بات یہ ہے کہ امجد اسلام امجد جیسے لوگ ہیں، جن کے سبب ایسی درخشندہ روایات زندہ رہتی ہیں۔ ہم جب اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے دورے پر گئے، پاکستان کے ادیبوں کے اس وفد میں عطاء الحق قاسمی اور محمود شام بھی شامل تھے۔ طلباء اور اساتذہ نے ہمیں امجد اسلام امجد کی شاعری کا جاپانی زبان میں ترجمہ دکھایا۔ ادیبوں کے وفد کے استقبال کے لیے طلباء وطالبات پاکستانی لباس زیب تن کر کے آئے تھے۔ جاپان میں میرے گھر پر قیام پر انہوں نے ایک مکمل مضمون تحریر کیا۔ جوان کی بذلہ سنجی کا عمدہ نمونہ ہے۔ نوجوان لکھنے والوں کی ہمیشہ

حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ان کی تربیت کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔گرچہ میں نے ان سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، چونکہ وہ نوے کی دہائی میں ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے اور میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِتعلیم رہا،مگر شعروسخن میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شعر کہنے کی صلاحیت تو خداداد ہے مگر کرافٹ سیکھنا پڑتا ہے۔موزونیت کی صلاحیت کا شکرادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کرافٹ پر بھی توجہ دی جائے۔بڑے ہمدرد اور مرنجان مرنج انسان تھے۔شہرت اور منصب بڑے اچھے لوگوں کا بھی اکثر دماغ خراب کر دیتے ہیں مگر امجد اسلام امجد مستثنیات میں سے تھے۔انتہائی منکسر المزاج۔اصل تعارف اور تحفہ تو ان کی شاعری قرار پائی ہے۔اگر میں کہوں کہ وہ ہمارے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے تو یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگی بلکہ حق گوئی اور سخن فہمی کہلائے گی۔بابا میاں چنوں کے دربار سے ملحقہ قبرستان سے مجھے کبھی نسبت محسوس نہیں ہوتی تھی تاوقتیکہ میری والدہ کا مدفن بن گیا، پھر تمام خوف جاتا رہا اور اپنائیت بھی ہوگئی۔لاہور کے میانی صاحب قبرستان سے اب قریبی نسبت پیدا ہوگئی ہے چونکہ امجد اسلام امجد کو وہاں دفن کیا گیا ہے۔

استادِ محترم۔شعیب ہاشمی

لمبی سفید گھنی مونچھیں۔ذہانت سے چمکتی سبز آنکھیں جن سے شرارت ٹپکتی بھلی لگتی تھی۔سرخ وسفید رنگت سے دمکتا چہرہ جس پر اکثر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔گورنمنٹ کالج لاہور میں جب ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو فوراً ہی پہچان گیا،اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹیلی ویژن پر ان کے بارہا کئی ڈرامے اور پروگرام دیکھ چکا تھا۔خاص طور پر''باؤ ٹرین''نامی ڈرامہ تو بہت ہی مقبول ہوا تھا جس میں ان کا مرکزی کردار ہوا کرتا تھا۔شعیب ہاشمی کے انتقال کی خبر سن کر دل بہت ملول ہے۔وہ علمی،ادبی شخصیت اور اعلیٰ پائے کے اداکار وہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرِ تعلیم بھی تھے،میری خوش قسمتی کہ ایم بی اے میں اکنامکس ان سے پڑھی۔بے حد شفیق استاد تھے۔بڑے ترقی پسند نظریات کے حامی تھے مگر کبھی بھی اپنے نظریات کو طالب علموں پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

پہلی نظر میں شعیب ہاشمی بڑے روایتی سے آدمی نظر آتے تھے۔شلوار قمیض میں ملبوس،پاؤں میں دیسی جوتا جسے پنجاب میں کھسہ کہتے ہیں،سردیوں میں کاندھے پر کھیس نما موٹی چادر،شال اٹھائے دراز قد کا ایک وجیہہ شخص قطعاً بھی انقلابی نہیں لگتا تھا۔مگر جب ان سے گفتگو شروع کرتے تو معلوم پڑتا کہ علم کا ایک سمندر بہتا ہے۔اکنامکس برطانیہ سے پڑھ کر آئے تھے،مقابلے کا امتحان دے کر بیوروکریٹ بننا چاہتے تھے۔سلیمہ ہاشمی سے محبت ہوئی تو انہوں نے شرط رکھ دی کہ میں کسی بیوروکریٹ سے شادی نہیں کروں گی۔محبت جیت گئی اور سلیمہ ہاشمی تادمِ مرگ ان کی واحد شریک حیات ومشکلات رہیں۔کچھ عرصے سے ہاشمی صاحب بیمار تھے۔ان کی قوت گویائی جواب

دے گئی تھی اور وہ وہیل چیئر پر تھے،مگر یقین کریں میرا ان کی موت کا تذکرہ کرنے کا ذرا بھی دل نہیں چاہ رہا،جی کرتا ہے ان کی 84 سالہ بھرپور زندگی کا ذکر کروں۔ان کے باغیانہ نظریات اور غیر روایتی خیالات پر روشنی ڈالی جائے۔وہ سوشلسٹ خیالات سے ہمدردی رکھتے تھے،میں انہیں بائیں بازو کا دانشور کہنا زیادہ مناسب سمجھوں گا۔ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ کٹر جمہوریت پسندی بھی ان کی ذات کا جزو لاینفک تھی۔مارشل لاؤں اور غیر جمہوری حکومتوں کے سخت ناقد تھے۔پاکستان کو ایک پھلتا پھولتا،ترقی کرتا ہوا جدید ملک بنتا دیکھنا چاہتے تھے۔آزادئ اظہار کے زبردست وکیل تھے۔

بڑے سخی آدمی تھے۔اپنے بنک اکاؤنٹ کے متعلق تو ان کا فرمانا تھا کہ ہمیشہ سرخ حاشیے کے اندر ہی رہتا ہے،کبھی اتنا سرمایہ جمع نہیں ہوتا تھا کہ نیلے خانے میں چلا جائے،مگر انہی کو دیکھ کر یہ احساس پختہ ہوا کہ خرچ کرنے کے لئے بہت زیادہ سرمائے کا ارتکاز شرط نہیں ہے۔ایک دن ان کی کلاس میں مجھے چھینک آئی اور ساتھ ہی ناک سے پانی بہہ نکلا۔میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوست سے رومال یا ٹشو مانگا۔ہاشمی صاحب یہ منظر دیکھ رہے تھے۔انہوں نے میرے دوست کو روک دیا اور اپنی جیب سے ذاتی رومال نکال کر مجھے دے دیا۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لو۔یہ کام کوئی بڑے دل والا ہی کر سکتا ہے،بات رومال کی قیمت کی ہرگز نہیں ہے،بات اس جذبے اور احساس کی ہے جو ان کے دردمند انسان دوست دل میں انسانیت کے لئے موجزن رہتا تھا۔ایسا بھی نہیں کہ میں ان کا سب سے پسندیدہ طالب علم تھا،اگر کوئی دوسرا شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے تو یقین کیجئے کا یہ دعویٰ باطل ہے،چونکہ شعیب ہاشمی اپنے طالب علموں کے درمیان اس طرح کی تفریق کے قائل نہیں تھے،کہ یہ پسندیدہ اور یہ کم پسندیدہ اور چند ناپسندیدہ۔وہ تو تمام معاشرے میں سماجی اور معاشی مساوات کے حامی اور خواہشمند تھے۔ویسے مذکورہ رومال میرے پاس اب بھی تبرکاً پڑا ہوا ہے۔

ان کی کلاس میں طالب علموں کو سگریٹ نوشی کی اجازت ہوتی تھی۔فرماتے تھے کہ اگر سگریٹ پینے کو دل کرے تو باہر جانے کی ضرورت نہیں کمرۂ جماعت میں ہی پی لیا کرو۔ساتھ ہی

بتانے لگے کہ یہ تھرڈ ائیر کے لڑکے بڑے نٹ کھٹ ہوتے ہیں، ایک دفعہ میں نے ان سے کلاس میں سگریٹ پینے کے موضوع پر گفتگو کے دوران تمباکو نوشی کی اجازت دے دی۔ اگلے دن کلاس میں پہنچا تو دیکھا کہ 41 میں سے 36 لڑکے سگریٹ سلگائے بیٹھے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا کہ کلاس نہیں بلکہ بھٹہ خشت ہے۔ تھرڈ ایئر کے طالب علموں کے شرارتی ہونے کی بابت ان کا مشاہدہ تھا کہ انٹرمیڈیٹ میں لڑکے عمومی ویسے ہی ڈرے، سہمے سے ہوتے ہیں، فورتھ ایئر میں میچور ہو چکے ہوتے ہیں۔ ویسے وہ سگریٹ نوشی کے کوئی بہت حامی نہیں تھے، کہتے تھے کہ سگریٹ پی کر سوئیں تو صبح دم اٹھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے منہ میں کتا مرا ہوا ہو۔

اب میں سگریٹ نوشی کے فوراً بعد ہی ان کے ساتھ پتنگ بازی پر بات شروع کر دوں تو شاید آپ کا میرے ممدوح سے دل ہی کھٹا ہو جائے۔ سچی بات مگر یہ ہے کہ شعیب ہاشمی اگر حیات ہوتے تو اس بات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ کرتے کہ آپ کی اس بابت قیمتی رائے کیا ہے۔ ہمارے ساتھ پتنگ بازی کرنے کے لئے چھت پر آئے تو سب سے پہلے ہماری چرخڑی کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ اسے نامرد ڈور لپیٹنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مستحسن طریقہ ڈور کا گولہ ہے، جسے ہمارے پنجاب میں ''پنّا'' کہا جاتا ہے۔ ہم نے اکنامکس کے علاوہ پتنگوں کے پیچ لڑانے بھی انہی سے سیکھے تھے۔ ہاتھ زخمی کئے بغیر ڈور چھوڑنے اور کھینچنے کا طریقہ ایسے احسن انداز میں ان سے پہلے اور بعد کسی نے بھی نہیں سکھایا اور سمجھایا۔

عہد ساز صحافی اور شاعر منو بھائی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ نواز شریف نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوسرے دور میں شریعت بل متعارف کروایا تھا۔ اس بل کے ناقدین کا اس بابت نعرہ ''شریعت منظور، شریعت بل نامنظور'' تھا۔ منو بھائی نے شعیب ہاشمی کو ٹیلی فون کر کے اطلاع دی کہ شریعت بل آ گیا ہے، تو ہاشمی صاحب نے پوچھا کہ آخری تاریخ کیا ہے اس بل کی؟ عموماً ہمارے محنت کش اور سفید پوش طبقے سے تعلق رکھنے والے گھرانے بجلی، پانی، گیس اور دیگر بل جمع کروانے کے لئے آخری تاریخ کا انتظار کرتے ہیں۔ اس آخری تاریخ کے استفسار سے شعیب ہاشمی کی بذلہ سنجی کے علاوہ

سیاسی شعور، حالات پر طنز اور دیگر بہت سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔اسی دور میں ہی جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کئے تو اس پر ہمیں شعیب ہاشمی کا ردعمل بڑا عجیب لگا۔ان کا موقف تھا کہ پاکستان کو یہ ''پٹاخے'' چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔طنزیہ پٹاخے کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ ان کی نظر میں ایٹم بم کوئی پٹاخہ تو ہے نہیں جو پتہ نہیں بوقت ضرورت چلے گا یا کہ نہیں چلے گا؟ایٹمی صلاحیت تو ہم حاصل کر ہی چکے تھے۔اس لئے اگر مغرب ہمیں اربوں ڈالر دھماکے نہ کرنے کے عوض دینے پر آمادہ تھا اور ہمارے قرض بھی معاف ہو رہے تھے تو ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کی معیشت کو بہتر بنانا چاہیئے تھا۔اس کی ایک وجہ عالمی امن کی ان کی خواہش اور جنگوں کے فلسفے کے خلاف ان کے نظریات بھی تھے۔منو بھائی کی بیٹی کی شادی کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے ریٹائرمنٹ کیوں لے لی ہے؟اس پر کہنے لگے کہ اب کیا تم لوگوں نے میرا خون پینا ہے؟اب تو میری ہڈیاں کھانا ہی باقی رہ گیا ہے۔سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے ہمیں تعلیم دی تھی۔بہت محنت اور صدق دل سے معلم کا ایک مثالی کردار نبھایا۔

فیض احمد فیضؔ کا داماد ہونا ان کا پاکستان کے ادبی حلقوں میں عمومی تعارف تھا۔مگر ہاشمی صاحب بڑے اعلیٰ ظرف کے آدمی تھے،خود باکمال مصنف اور ماہر تعلیم ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ خندہ پیشانی اور کھلے دل سے اس تعارف کو بھی قبول کرتے تھے۔ان کی بیٹی میرا ہاشمی اور بیٹے یاسر ہاشمی کے لئے یہ وقت یقیناً مشکل ہوگا۔مگر خالق کائنات کا یہی نظام ہے کہ جو اس دنیا میں آیا،اس نے واپس اپنے مالک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کی اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے۔اجمل نیازی

خوبصورت لہجے کے تابندہ شاعر،منفرد ادیب،مقبول کالم نگار،ٹی وی اینکر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اجمل نیازی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔وہ درویش صفت مگر تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال لکھاری تھے۔مندر میں محراب کے نام سے ہندوستان کا رجحان ساز سفر نامہ تحریر کرنے کے علاوہ کئی شعری مجموعوں کے خالق اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔زندگی کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گزارا مگر اپنی جنم بھومی عیسیٰ خیل سے اپنی نسبت کو کبھی نہیں بھولے اور نہ کبھی کسی سے چھپایا، بلکہ فخریہ انداز میں میانوالی کی مخصوص پگڑی پہنتے تھے۔ان کی دستار اپنی اصل سے جڑے رہنے اور ایک جینوئین آدمی ہونے کی علامت تھی۔کبھی فراموش نہیں کیا کہ کس سرزمین سے آئے ہیں۔یہاں تک کہ میانوالی کے شعراء کرام کے تذکرے پر مبنی ایک مکمل کتاب لکھ ڈالی۔جو کہ ''جل تھل'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔جس طرح انہوں نے اپنی مٹی سے تعلق اور ناطہ نہیں توڑا،یہی رویہ ان کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔وہ تعلق نبھانے والے آدمی تھے۔

ڈاکٹر اجمل نیازی سے میرا پہلا تعارف تب ہوا جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے اور میں وہاں طالب علم تھا۔اگرچہ میں خود ان کا اسٹوڈنٹ نہیں تھا مگر نیو ہوسٹل میں میرا روم میٹ نصیر خان ان سے اردو پڑھتا تھا۔ہم اکثر ان کی باتیں آپس میں کرتے رہتے تھے۔جتنا روایتی ان کا حلیہ اور ہیئت کذابی تھی،اتنے ہی غیر روایتی ان کے نظریات اور باتیں ہوتی تھیں۔گورنمنٹ کالج میں کسی دور میں وہ خود بھی زیر تعلیم رہے تھے، بلکہ مجلّہ ''راوی'' کی مجلس ادارت

میں بھی شامل تھے۔زمانہ طالب علمی میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی زیر تعلیم رہے اور اس کے میگزین ''محور'' کی ادارتی ٹیم کا حصہ رہے تھے اور مختلف مجالس سے بھی ان کی وابستگی رہی۔شعبہ تدریس سے وابستگی کے دوران وہ راول پنڈی کے گورڈن کالج اور میانوالی کالج کے علاوہ ایف سی کالج میں بھی علم کی روشنی بکھیرتے رہے۔ان کی رخصتی کا دکھ اس لئے بھی زیادہ ہے چونکہ وطن عزیز پہلے ہی قحط الرجال کا شکار ہے۔ایسے تاریک دور میں ان جیسے جگنو کا بجھ جانا تیرگی کو اور گہرا کر گیا ہے،تاریکی مزید بڑھ گئی ہے۔عربی زبان میں مثل مشہور ہے کہ ایک عالم کی موت، عالم کی موت ہوتی ہے۔ایسے پڑھے لکھے اور لکھنے والے لوگ آج کل مشکل سے ملتے ہیں، زیادہ تر تو خالی برتنوں کی طرح شور مچاتے ہیں اور اندر سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔

نیازی صاحب بڑے انسان دوست شخص تھے اور انتہائی محبت کرنے والے۔جذباتی، بلکہ یوں کہہ لیں کہ جلالی حد تک جذباتی تھے مگر کھرے اور سچے انسان تھے۔ان کا ظاہر باطن ایک تھا۔ان کا کھرا پن بعض لوگوں کو ناگوار بھی گزرتا تھا۔جعفر بلوچ جو کہ بنیادی طور پر ان کے وسیب سے تعلق رکھنے کے علاوہ لاہور میں بھی ایک طرح سے ان کے ہمسائے تھے،ایک دن ان کی بے باکی،صاف گوئی سے عاجز آ کر کہہ گئے

عیاں یہ بات تیری ایک ایک کل سے ہے
کہ تو جمال سے اجمل نہیں جمل سے ہے

اس شعر میں جعفر بلوچ کی معاصرانہ چشمک بھی عیاں ہے مگر اب یہ دونوں بہشت نصیب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہو چکے ہیں، وہاں وہ ان پر رحمت کرے گا۔نیازی صاحب بڑے مخلص تھے۔خلوص کے بندے ہونے کے ساتھ ساتھ یاروں کے یار تھے۔بنیادی طور پر مجلسی شخص تھے۔بزم آرائیاں پسند کرتے تھے۔لوگوں کے دکھ اور سکھ میں شرکت کر کے طمانیت محسوس کرتے تھے۔کمال درجے کے مٹے ہوئے انسان تھے۔صوفیانہ عاجزی اور انکساری ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔انا پرستی اور عاجزی کے حسین امتزاج کا پیکر شخصیت فقط انہی کا حصہ تھی۔میں نے ان کی داڑھی کو مکمل سیاہ سے

پوری سفید ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس لئے یہ اوصاف حمیدہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں۔ آخری ملاقات کر کے رخصت ہونے لگا تو وہ ننگے پاؤں مجھے اپنے گھر کے دروازے کے باہر تک چھوڑنے کے لئے آئے تھے، بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ شائد یہی منظر دیکھ کر سیف ڈرائیور کا کہنا تھا کہ آپ کے بہت سارے اہل قلم دوستوں سے مل چکا ہوں مگر اجمل نیازی جیسا عظیم انسان ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ وحدت کالونی کے اس سرکاری گھر سے اب انہیں اپنائیت محسوس ہونے لگی تھی۔ بتانے لگے کہ اس مکان کا کرایہ نامہ اب میں نے اپنے بیٹے کے نام منتقل کر دیا ہے جو کہ سرکاری ملازم ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا جنازہ مذکورہ مکان سے ہی اٹھایا جائے۔ اللہ پاک نے ان کی یہ تمنا پوری کر دی۔

اپنے سے جونیئر اور عمر میں چھوٹے اہل قلم کی بات ہمیشہ بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ بے نیاز ایسے تھے کہ حاکم وقت اور بڑے بڑے طاقتوروں کی ناراضگی کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتے تھے۔ شاید اسی شخصی پہلو کے سبب اپنے اخباری کالم کا عنوان انہوں نے ''بے نیازیاں'' رکھا تھا۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نا صرف پرچار کرتے تھے بلکہ پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذاتی زندگی میں ان اعلیٰ انسانی صفات کا عملی نمونہ تھے۔ کمال کے فقرے باز اور بزلہ سنج تھے مگر پھکڑ بازی نہیں کرتے تھے۔ ان کے اندر مگر ایک مخصوص اداسی تھی جس کا ظہار ان کی شاعری میں بھی جا بجا ہوتا ہے۔

اجمل ہوں وسط شہر میں اجڑا ہوا مکان
پاس آ کے لمحہ بھر کوئی بیٹھتا نہیں

حکومت کی طرف سے ان کو ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا تھا۔ اس تمغے کے تذکرے کا مطلب نیازی صاحب کی عزت افزائی نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ کبھی کبھی سرکاری اعزازات اہل اور حق دار لوگوں کو بھی مل جاتے ہیں۔ اپنی 1947 کے سن میں پیدائش کو وہ پاکستان کے وجود میں آنے کے واقعے کے ساتھ نسبت کے سبب، خود کو پاکستان کا ہم عمر کہتے تھے۔ ہائے افسوس! ہم پاکستان کی ڈائمنڈ جوبلی ڈاکٹر اجمل نیازی کے بغیر ہی منائیں گے۔

انا للہ وانا علیہ راجعون

جی بسم اللہ اختر شمار

کبھی کبھی ایسے لوگ بھی دنیا کا میلہ چھوڑ جاتے ہیں کہ جن کی موت کا یقین ہی نہیں آتا۔دل ودماغ کسی طور پر داغ مفارقت دے جانے والے کے نام کے ساتھ مرحوم لکھنے پر راضی نہیں ہوتے۔کچھ ایسی ہی کیفیت خوبصورت لہجے کے توانا شاعر اختر شمار کے انتقال پر مجھ پہ طاری ہے۔اب چونکہ ان کا چہلم بھی گزر گیا ہے اس لئے حوصلہ کر کے لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ایسی شہرت،محبت اور قبولیت بہت کم کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے جیسی اختر شمار کے حصے میں آئی۔کہنہ مشق ادیب،مقبول صحافی،منفرد کالم نگار،ایثار کیش معلم وماہر تعلیم،ان کی علم وادبی شخصیت کے اتنے پہلو اور جہتیں ہیں کہ فقط تعارف کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے۔یہاں اگر میں یہ کہوں کہ ان کا شمار ادبی صحافت کے بانیوں میں ہوتا ہے تو یہ مبالغہ آرائی نہ ہوگی بلکہ سراسر حق بیانی ہے۔مقبول پرچہ ''بجنگ آمد'' ان کے اس شوق کی فراوانی کی سب سے بڑی گواہی ہے۔

اختر شمار کا پیدائشی نام اعظم خان تھا۔ملتان میں اپریل 1960 کو پیدائش ہوئی، اگرچہ آباؤاجداد کا علاقہ چکری،راولپنڈی کے نزدیک پوٹھوہار میں واقع سہال تھا۔دکھی دل کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس روشن دماغ قلم کار کی تدفین بھی وہیں پر ہوئی۔ان کے والد نے عرصہ پہلے ملتان سکونت اختیار کر لی تھی۔اختر شمار کی پیدائش کے بعد ابتدائی تعلیم اور گریجوایشن بھی ملتان کی درس گاہوں میں ہی ہوئی۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ایم اے کرنے کے لئے گئے اور تعلیم مکمل کر کے بھلے شاہؒ کی نگری قصور کے کالج میں شعبہ تدریس سے منسلک ہوگئے۔لاہور میں ان کی آمد کا بنیادی محرک

تو شاید گورنمنٹ کالج لاہور میں طلباء کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا مگر اس شہر کے ادبی حلقوں میں ان کے آنے سے گویا بھونچال آ گیا۔ اگر مثبت انداز میں بات کروں تو ادبی چائے خانوں میں نئی زندگی اور جان پڑ گئی۔ ایسی توانا آواز کہ کوئی بھی شعر و سخن سے تعلق رکھنے والا شخص اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ تحقیق کے میدان کی بات کریں تو ''حیدر دہلوی احوال و آثار'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور سند پائی۔ ایک درجن سے زائد کتابیں اپنی مختصر مگر بامعنی زندگی میں تحریر کر گئے۔ جیسی خوبصورت ان کی شاعری تھی ویسی ہی عمدہ اور معیاری نثر تحریر کرتے تھے۔ کچھ عرصے سے 'جی بسم اللہ'' کے عنوان سے کام نگاری کر رہے تھے جبکہ اس سے پہلے ایک طویل عرصہ اختر شماریاں کے نام سے کالم تحریر کرتے تھے۔ کالم کے عنوان کی تبدیلی کا ذکر میں نے دانستہ طور پر کیا ہے۔ یہ تبدیلی ان کی ذاتی زندگی میں بھی آئی تھی، اس کا محرک فکر کی تبدیلی وارتقاء بھی تھا۔ ان کا رجحان تصوف کی طرف ہو گیا تھا۔ میں نے اختر شمار کو ایک عام سے دنیادار ادیب سے ایک صوفی درویش بنتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ من کی تبدیلی تھی۔ انہوں نے کوئی اپنا لباس یا رہن سہن تبدیل نہیں کیا تھا۔ معمولات زندگی بھی بالکل ویسے کے ویسے اور وضع قطع بھی پہلے جیسی تھی۔ مگر ان کے اندر ایک جوہری تبدیلی آ گئی تھی۔ ان کے کالم کا عنوان ''جی بسم اللہ'' دراصل ان کے روحانی مرشد کا تکیہ کلام تھا۔ مرشد کے رنگ میں ''گوڑھے'' رنگے گئے تھے۔

دراز قد، گھنی زلفوں، روشن آنکھوں والے، روشن دماغ اختر شمار سے میری پہلی ملاقات احمد ندیم قاسمی کے ہاں فنون کے دفتر میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب ان سے کچھ نالاں تھے، وجہ شاید اختر شمار کے پرچے ''بجنگ آمد'' میں شائع ہونے والی کچھ نامناسب خبریں تھیں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ کہنے لگے یہ محبت ایسی چیز ہے کہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی، خود بخود نظر آ جاتی ہے، محسوس ہو جاتی ہے۔ جبکہ اختر شمار اپنی محبت و عقیدت کا یقین دلاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ چھوٹی موٹی گستاخیاں میں کر جاتا ہوں، درگزر کر دیا کریں۔ اس سے یہ نتیجہ مت اخذ کریں کہ مجھے آپ سے کم محبت ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے اختر شمار کی صاف گوئی بڑی اچھی لگی، جب انہوں نے اسی

ملاقات میں کہا کہ میں خوشامد نہیں کرسکتا ورنہ آپ میرے بھی ویسے ہی محبوب ہیں جیسے آپکے دیگر رفقاء کا دعویٰ ہے۔ایسے مخلص اور دلیر سخن ور کی کمی بھلا کیسے پوری ہوسکتی ہے جو شاعر ہونے کے باوجود مبالغہ آرائی نہ کرتا ہو۔میری دعوت پر بارہا میاں چنوں تشریف لائے۔جب کبھی، جہاں کہیں مشاعرے پر بلایا ضرور تشریف لائے۔یاروں کے یار مشاعرے باز آدمی تھے۔ان جیسی داد اور واہ! واہ! مشاعروں میں بہت کم شعراء کرام کے حصے میں آتی ہے۔شاعر بھی تو بے بدل تھے۔نصرت فتح علی خاں نے ان کی غزل کے یہ اشعار تو گا کر مزہ دوآتشہ کر دیا

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں
مطمعین ایسے ہے جیسے کہ ہوا کچھ بھی نہیں
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

میرے ساتھ ان کی ایک خاص نسبت وسیب سے تعلق کے علاوہ یہ بھی تھی کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''روشنی کے پھول'' ہائیکو شاعری پر مشتمل تھا جو کہ 1985 میں شائع ہوا تھا۔گزشتہ دو دہائیوں سے جاپان میں میرے قیام کے علاوہ میرے خاندان کو جاپان کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے، اور یہ صنف سخن ہائیکو چونکہ جاپان سے پھوٹی ہے اور اس کے ادب کی بنیادی اساس ہے تو یہ بھی ایک قدر مشترک ٹھہری۔پسماندگان میں ان کے بے شمار چاہنے والوں کے علاوہ چار بیٹے اور بیوہ شامل ہیں۔اس لحاظ سے خوش قسمت نکلے کہ بچے بڑے لائق اور فرمان بردار ہیں۔

آخری ملاقات ان سے پچھلے دنوں ایف سی کالج لاہور کے شعبہ اردو میں ہوئی، جس کے وہ صدر نشین تھے۔بے حد محبت اور اپنائیت سے ملے، جب سے انہوں نے درویشی اور روحانیت کی سمت سفر شروع کیا تھا، ان کے رویے میں شفقت، عاجزی اور انسان دوستی کا پہلو پہلے سے زیادہ

نمایاں ہوگیا تھا۔ بے حد مہربان اور شفیق ہوگئے تھے، مجھے لگتا ہے شاید ان کی شخصیت میں یہ رنگ ان کے روحانی مرشد کی جانب سے آیا تھا۔

زندگی کا ایک خوبصورت اور بھرپور حصہ مصر میں گزارا، جہاں وہ تین سال تک شہرہ آفاق جامعتہ الازہر اور اس کے بعد چند دیگر تعلیمی اداروں میں اردو پڑھاتے رہے۔ان کی کتاب ''موسیٰ سے مرسی تک''میں اس تجربے کی جابجا جھلک ملتی ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا،ان کی پہلی کتاب ''ہائیکو'' پر مشتمل تھی جو کہ جاپانی ادب کی صنف سخن ہے جبکہ ان کا پہلا باقاعدہ شعری مجموعہ 1992 میں ''کسی کی آنکھ کے ہوئے ہم'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔اس سے اگلے برس ہی ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''یہ آغاز محبت ہے'' کے عنوان سے منظر عام پر آ گیا۔جس مشاعرے میں جاتے اسے چار چاند لگا دیتے تھے۔کیا دبنگ لہجہ اور بلند آہنگ تھے،ریڈیو اور پی ٹی وی کے بے شمار پروگراموں کی میزبانی بھی کی،اس میں بھی اپنے اعلیٰ معیار کا خیال رکھا۔کچھ عرصے سے جگر کے عارضے میں مبتلا تھے۔ان کے بچوں نے علاج کے لئے بہت بھاگ دوڑ کی مگر علاج تو بیماری کا ہوسکتا ہے،موت کا تو کوئی علاج نہیں،جب اس کا وقت آ جائے،یہ بیماری نہ ہوتی تو کوئی اور بہانہ بن جاتا،سب موت کے بہانے ہیں۔پروردگار ان کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ادبی وصحافتی منظر نامے پر ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔

منشاء یاد کا فن اور شخصیت

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے طرفدار بھی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط اور ظروف نگار منشاء یاد کا نام آرٹ سے وابستہ لوگوں کے لئے جانا پہچانا اور معتبر ہے۔ میری ان سے ایک خصوصی نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ میاں چنوں ہم دونوں کی مشترکہ جنم بھومی ہے۔ کئی عشروں سے منشاء یاد کیلی گرافی، پورٹریٹ، سیکیچز، بلیو پورٹری اور دیگر متعدد شعبہ ہائے فن میں اپنا تخلیقی سفر بڑی شدّ ومدّ اور محنت ومحبت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ارتقائی سفر ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اب اوج کمال پر پہنچ چکا ہے۔ مقامی، قومی اور عالمی سطح پر ان کے فن پاروں کی بے شمار نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔ بلا مبالغہ دنیا کے درجنوں ممالک کی اہم دیواروں پر ان کے فن پارے آویزاں ہیں جو ان کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ گرچہ ابتدائے سفر میں وہ پہلے پہل خود ہی کوشش کرتے رہے، پھر معروف خطاط اظہر قلمکار کی شاگردی اختیار کر کے ایک سال تک ان کے ہمراہ کام کرتے اور سیکھتے رہے۔ پھر ایک سال فلموں کے پوسٹر بناتے رہے۔ مگر اس تمام عرصے میں انہیں احساس ہوتا رہا کہ یہ ان کی منزل اور منشاء نہیں ہے۔ کالج ایف ایس سی کے دوران شروع ہونے والا یہ سفر جب وہ ساہیوال میں گریجوایشن کر رہے تھے تب بھی جاری وساری رہا اور ایم ایس سی شعبہ شماریات میں ان کی صلاحتیں مزید نکھر آئیں۔ کسی بھی فن کار کے لئے اپنا حقیقی تخلیقی جوہر تلاش کرنا محنت طلب اور جدوجہد کا متقاضی عمل ہوتا ہے۔

اسلامک خطاطی کی جانب ان کا رجحان تو ابتدائے سفر فن سے ہی تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے محسوس کیا کہ یہی ان کا اصل خداداد تحفہ اور صلاحیت ہے۔ مقابلے کا امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کے بعد بھی ان کا تعلیم کے شعبہ سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ مگر ان کا اصل تخلیقی جوہر اور جذبہ جنون قلم اور موئے قلم سے جڑا ہوا رنگوں اور کینوس سے متعلق ہی رہا۔ ان کے تخلیقی سفر میں ایک اہم موڑ ظروف نگاری کی طرف آیا۔ ملتان کی تاریخی اور روایتی نیلے رنگوں کی مشہور زمانہ بلیو پوٹری و سرامک کو انہوں نے اسلامک خطاطی سے ہم آہنگ کر کے اک نیا تخلیقی رچاؤ پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی اپنے فن سے کمٹمنٹ ہی تھی جس نے انہیں فن خطاطی میں استعمال ہونے والے تمام اہم خطوط سیکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کے فن پارے دیکھیں تو آپ کو خط ثلث، خط کوفی، خط نسخ، خط شکستہ، خط رقعہ اور خط دیوانی میں ان کا کیا ہوا خوبصورت تخلیقی کام نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہی خطوط کو برش اور کینوس پر فقط رنگوں سے آرٹ کا شاہکار نہیں بنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سرکنڈے کے قلم اور قرطاسِ ابیض پر بھی ایک سے بڑھ کر ایک تخلیقی نمونہ ان کی آرٹ گیلری میں ملتا ہے۔ کورین آرٹ میں اسکرین پرنٹنگ میں بڑا تخلیقی کام ہوتا ہے، منشاء یاد نے اس شعبۂ فن میں بھی بہت کام کیا اور کمال مہارت حاصل کی ہے۔ قرآنی آیات کی خطاطی سے انہیں خصوصی لگاؤ ہے اور ان کا یہ فن خیرہ کن ہے۔ 2003 میں خانہ

فرہنگ ایران کی جانب سے منعقدہ نمائش میں انہوں نے حصہ لیا اور بہترین آرٹسٹ کا ایوارڈ جیت لیا۔ جب کہ الحمراء آرٹس کونسل میں منعقد ہونے والی متعدد نمائشوں میں بھی بارہا حصہ لیا اور انعامات حاصل کئے۔ کئی برادر اسلامی ممالک کے سفارتخانوں کے لئے ان سے اسلامی خطاطی کے نمونے بنوائے گئے۔ ایران و عرب میں ان کے فن کو بہت پذیرائی ملی ہے۔

منشاء یاد فن پاکستان کا فخر اور نشان ہے۔ ارباب اقتدار اور حکومت کے ذمہ دار اہلکاروں کو چاہیئے کہ ان کے تخلیقی کام کو سرکاری سرپرستی فراہم کریں۔ سفارت خانوں اور دیگر اہم سرکاری دفاتر میں ان کے فن پارے سجانے کے قابل ہیں۔ ان کا فن ہماری ثقافت اور فنکارانہ عظمت

کا بھی ثبوت ہے، نگارخانوں اور عجائب گھروں میں ان کا کام پہنچائے جانے کا حق دار ہے۔ یہ منشاء یاد کے اعتراف فن تک محدود بات نہیں ہے بلکہ نوجوان نسل کو ایک مثبت جہت سے روشناس کرانے کی کوشش بھی ہے۔ ایسی ہی کوشش میاں چنوں میں آرٹ گیلری کی صورت میں انہوں نے پیش کی ہے، جس کا مقصد نوجوان نسل کی رہنمائی کے علاوہ اسلاف کی درخشندہ روایات کی آبیاری بھی ہے۔ منشاء یاد کے لئے کلر بلائینڈ ہونے کے سبب رنگوں کی دنیا میں خود کو منوانا آسان کام نہیں تھا، مگر ان کی مسلسل جدوجہد اور شوق کی فراوانی نے یہ معجزہ ہنر کر دکھایا۔

احمد ندیم قاسمی کی یادیں

پندرہ برس پہلے یہ جولائی ہی کا مہینہ تھا۔ جب عہد ساز ادیب، شاعر اور صحافی احمد ندیم قاسمی ہم سے جدا ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا اس لئے بھی کبھی پر نہیں ہوسکتا کیونکہ احمد ندیم قاسمی فقط ایک فرد کا نام نہیں بلکہ اردو شعر و ادب اور صحافت کے ایک عہد کا نام ہے۔ وہ قلم قبیلے کا ایسا روشن حوالہ ہیں جس کی چکا چوندان کی موت بھی کم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اہل قلم کا ایک قافلہ انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کیا جس کے نا صرف وہ میرِ کارواں تھے بلکہ استاد اور سالار بھی تھے۔ ان کی شاگردی میرے لئے تو ہمیشہ باعثِ اعزاز اور ''قاسمی سکول آف تھاٹ'' سے تعلق افتخار کی بات رہی ہے۔ ایسی شاندار، بامقصد، بامعنی زندگی گزارنے والے شخص کی حیات جاوداں چراغوں کے ایک سلسلے کی طرح ہماری جہالت کے اندھیرے مٹاتی اور رہنمائی کرتی چلی جاتی ہے۔ قاسمی صاحب کے چہرے پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا۔ ان کے لہجے کی نرمی سے ان کی سخت اصول پسندی اور نظریاتی وابستگی کی گہرائی کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

اگر کہا جائے کہ برصغیر پاک و ہند میں روزنامہ امروز پہلا اردو اخبار تھا جسے عوامی مقبولیت اور قبولیت حاصل ہوئی تو یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حق بیانی ہوگی۔ احمد ندیم قاسمی نہ صرف اس کے ایڈیٹر رہے بلکہ اردو صحافت کی تاریخ میں جو معتبر مقام روزنامہ امروز کو حاصل ہے اس میں کلیدی کردار قاسمی صاحب کا ہی تھا۔ صحافیوں کی ایک پوری نسل کی انہوں نے تربیت کی اور تادم مرگ جنگ اخبار میں باقاعدگی سے کالم لکھتے رہے۔ امروز ان کی ادارت کے دنوں میں ترقی پسند اور بائیں بازو کے

نظریات کا حمایتی اخبار تصور کیا جاتا تھا۔ جنرل ایوب خان نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد قاسمی صاحب پابندِ سلاسل کر دیئے گئے۔ ان کا اخبار قومیا لیا گیا۔ ایک شام ٹمپل روڈ لاہور میں ان کے اشاعتی ادارے ''اساطیر'' کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی گرفتاری کی روداد بیان کی تھی۔ بتاتے تھے کہ لباس اور جوتے تبدیل کرنے کی اجازت بھی سرکاری حکام نے بمشکل عطا فرمائی تھی۔ آزادی صحافت اور جمہوریت کی بالا دستی کے لئے بار ہا انہیں جیل جانا پڑا۔ نظریاتی آدمی تھے لہٰذا ماتھے پر کبھی شکن نہیں لے کر آئے۔ حریت فکر کا راستہ انہوں نے خود ہی اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ مجبوری نہ تھی۔

محبت کرنے والے آدمی تھے یوں کہہ لیجئے کہ سراپا محبت تھے۔ ہمارے ایک ہم عصر شاعر ان کے دفتر میں بیٹھے ایک دن قاسمی صاحب کو اپنی بدگوئی اور جھوٹے پروپیگنڈے کی صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کا یقین بھی دلانا چاہتے تھے۔ مذکورہ شاعر چونکہ ایک ادبی چیتھڑے کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں قاسمی صاحب کے بارے میں بدزبانی اور بے سروپا الزام تراشی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ میں نے جب یہ منظر دیکھا تو اس بات پر حیران تھا کہ قاسمی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ مصنوعی نہ تھی بلکہ محبت سے لبریز تھی۔ معاصر شاعر کو کہنے لگے کہ ''محبت ایسا جذبہ ہے کہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کا پتہ چل جاتا ہے، خود بخود'' بتاتے تھے کہ اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے شاعری سے کیا تھا۔ بعد ازاں افسانہ نگاری اور کالم نویسی کی جانب راغب ہوئے۔ اقبال، ظفر علی خاں اور اختر شیرانی کی شاعری انہیں زیادہ پسند تھی۔ جبکہ افسانے کے معاملے میں وہ منشی پریم چند کے عاشق تھے۔ فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا انگریزی کی ترکیب کے مطابق ''لو ہیٹ'' یعنی محبت اور نفرت کا ملغوبہ نما تعلق تھا۔ یہ تعلق تھا مگر بہت گہرا۔ دونوں ہم عصر بائیں بازو کے شاعر، ایک ہی اخباری گروپ کے ایڈیٹر، یاد رہے کہ فیض صاحب انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے انہی دنوں ایڈیٹر تھے جن دنوں قاسمی صاحب امروز کے مدیر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ان دونوں نابغہ روزگار شخصیات کی باہمی خط و کتابت بھی رہی جو کہ اب کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے اور خاصے کی چیز ہے۔ گرچہ دونوں کے درمیان

معاصرانہ چشمک بھی پائی جاتی تھی۔

ایک دن میں نے قاسمی صاحب سے فیض احمد فیض کا ذکر چھیڑ دیا۔ان کے چند شعر سنائے، چونکہ آدھا ''نسخہ ہائے وفا'' تو مجھے زبانی یاد تب بھی تھا،اپنے اور فیض صاحب کے باہمی تضادات کا ذکر کرنے لگے۔چین کے دورے کا تذکرہ چھیڑ دیا، کہنے لگے کہ فیض اور میں ایک جھیل کی سیر کے موقع پر ایک کشتی میں سوار تھے۔فیض صاحب رسیا آدمی تھے۔دیگر موجود احباب بھی ان کے ساتھ مہ نوشی میں مشغول تھے۔ان کے دل میں نا جانے کیا آئی کہ ایک جام شراب کا بھر کر مجھے بڑی لجاجت سے پیش کرنے لگے۔میں نے انکار کیا۔اصرار بڑھتا گیا تو میں نے جام تھام لیا۔کچھ توقف کے بعد میں نے اس جام کو جھیل کے پانی میں انڈیل دیا۔یہ دیکھ کر فیض صاحب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔کہنے لگے تم نے شراب کی توہین کی ہے،اب میں کبھی تمہیں شراب پیش نہیں کروں گا۔قاسمی صاحب صاف ستھرے آدمی تھے۔زندگی میں کبھی شراب نوشی نہیں کی۔ان کا کہنا تھا کہ میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک سیدھا سادہ مسلمان بھی ہوں۔میں نے انہیں کبھی میلے لباس میں
نہیں دیکھا، روزانہ شیو بناتے تھے،نوے سال کی طویل عمر پائی مگر عمر کے آخری برسوں میں
بھی ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ انہیں مستعد پایا۔منیر نیازی انہیں ''سدا بہار بوڑھا'' کہتے تھے۔منیر نیازی صاحب کی باتوں کا کیا برا ماننا،''بڑے آدمی تھے'' خیر یہ تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں کہ مجھے انٹرویو دیتے ہوئے قاسمی صاحب نے بھی منیر نیازی کے بارے میں کہا تھا کہ وہ صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں،انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے آپ کو نقاد بھی بہت ملیں گے۔جس کی وجہ میری نظر میں تو واحد یہ ہے کہ ان کی سماج میں عزت اور اثر ورسوخ چونکہ بہت زیادہ تھا،اس لئے بہت سارے لوگ ان کو ہدفِ تنقید بنا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ذاتی طور پر ان کا ماننا تھا کہ میری مخالفت کا آغاز اس وقت ہوا جب رسالہ ''فنون'' جاری ہوا۔یاد رہے کہ قاسمی صاحب نے نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو زبان و ادب کے اس سب سے معتبر و مؤقر رسالے کی ادارت کا فریضہ بھی انجام

دیا۔آج کل ان کی دختر نیک اختر ان کا یہ ادبی مشن جاری رکھے ہوئے ہے۔

احمد ندیم قاسمی جیسا نفیس اور شائستہ آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔غیرت منداور ہمدرد،شفیق مگر اصول پرست،روشن خیال مگر بلند کردار۔اپنی زندگی کی آخری دو دہائیاں ہم نے انہیں لاہور کے مال روڈ پر مجلس ترقی ادب کے دفتر میں صدر نشین کی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ضعیفی کے باوجود ایک عجیب وقار،رعب اور طنطنہ تھا ان کی شخصیت کے اندر کرسی پر ڈھیلے ،ڈھالے نہیں بیٹھتے تھے۔بلکہ الرٹ اور تیر کی طرح سیدھی کمر کے ساتھ۔انتہائی غریب پرور انسان تھے۔دوسروں کے کام آنے والے۔ایک محنت کش اور غیرت مند ماں کی اولاد تھے جو کہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی،انا اور غیرت کے ساتھ مفلسی کے مشکل دن بچوں کے ساتھ کاٹنے والی اس عورت کی ساری خوبیاں ان کے بیٹے میں بھی نظر آتی تھیں،دنیا جسے آج احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے۔پاکستان کے تمام اہم سرکاری اعزازات اور تمغے انہیں ملے لیکن میں نے قصداً ان کا ذکر نہیں کیا۔چونکہ اقربا پروری اور سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر اعزازات کی لوٹ سیل نے ان کی قدر و قیمت کو ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قیمت سے بھی کم کر دیا ہے۔کسی بھی تخلیق کار کے لئے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ عام لوگ اسے کیسے یاد رکھتے ہیں؟اس بے بدل شاعر اور اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کا اصل اعزاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔اہلِ محبت دعاؤں میں اسے یاد کرتے ہیں۔انہی کے ایک شعر کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

قائم نقوی۔اک چراغ اور بجھا

نامور مدیر،خوبصورت لہجے کے شاعر،منفرد ادیب اور محقق قائم نقوی اب ہم میں نہیں رہے۔عشرہ محرم کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان میں محفل مسالمہ منعقد تھی،شہدائے کربلا کے حضور اپنا سلام پیش کر کے ریڈیو کی کنٹین تک آئے تھے کہ لیلائے اجل نے آلیا۔دل کا دورہ ان کی رحلت کی وجہ بیان کیا جاتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ان کا اس دنیا سے دانا،پانی اور وقت ختم ہو گیا تھا۔قائم نقوی ایک ادبی و علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے والد مولانا سید منظور حسین نقوی ایک معروف و معتبر عالم دین تھے۔ان کی مرتب کردہ کتاب ''تحفتہ العوام'' بے حد مقبول کتب میں شامل ہوتی ہے۔ان کے حقیقی بھائی قم یونیورسٹی ایران میں پرنسپل ہیں۔قائم نقوی کا اصل نام سید قائم حسین نقوی تھا،طویل عرصے تک ادبی ماہنامہ ماہِ نو کے مدیر رہے،بعدازاں ''نمود'' کے نام سے انہوں نے اپنی ادارت میں ذاتی پرچہ نکالا۔ان سے میرا پہلا تعارف اپنے کالج کے ساتھی اور شاعر دوست تیمور حسن تیمور کے گھر پر ہوا۔بہت ہی شائستہ انسان اور شستہ زبان بولنے والے تھے۔سادہ مزاج مگر انتہائی اصول پرست۔درویش صفت اور صوفی منش تھے۔کئی کتابوں کے مصنف قائم نقوی 6 جون 1949ء کو شہر لاہور میں پیدا ہوئے اور 73 برس کی بامعنی عمر پا کر اسی شہر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

نہایت نفیس طبیعت کے مالک تھے۔بصارت سے محروم مگر بصیرت سے مالا مال تیمور حسن تیمور کی سائنس کالج میں واقع رہائش گاہ پر پہلی ملاقات میں انہوں نے اپنا ادبی پرچہ ''نمود'' مجھے تحفتاً پیش کیا۔ایسے مہذب تھے کہ لفافے میں بند کر کے بڑی رازداری کے ساتھ جسے دینا ہوتا بڑے دھیمے

لہجے میں بات کر کے پرچہ نذر کرتے۔ یہ منظر معروف شاعر حسن عباسی نے دیکھا تو از راہ تفنن میرے کان میں کہنے لگے کہ یہ خفیہ ایجنسیوں کا پرچہ معلوم ہوتا ہے۔نہایت عاجزانہ اور ملنسار طبیعت کے مالک تھے،شاید اسی سبب سے تین مرتبہ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ان کی دھیمے لہجے کی پراثر شاعری دل پر پھوار کی طرح گرتی ہے۔نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔میں ابھی طالب علم تھا جب ماہ نو میں لکھنا شروع کیا اور ان کو ہمیشہ انتہائی شفیق اور مہربان پایا۔ان کی شاعری اور نثر دونوں اپنے عہد کی کیفیات بیان کرتی ہیں۔ان کا تخلیقی کام تادمِ مرگ جاری رہا۔ان کی شخصیت کا ایک پہلو کالم نگاری تھا۔روزنامہ نوائے وقت اور مغربی پاکستان نامی رسالے میں طویل عرصہ کالم لکھتے رہے۔وزارت اطلاعات ونشریات سے بھی وابستہ رہے اور بطور ڈپٹی ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔ریڈیو پاکستان سے ان کو خاص نسبت تھی اور یہ وابستگی تیس سال پر محیط تھی۔اپنے ادبی وعلمی سفر کے دوران انہوں نے آٹھ کتابیں تخلیق کیں،جن میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کی کتب شامل ہیں۔ان کی پنجابی شاعری کا مجموعہ ''بیلے رمزاں دے'' کے نام سے شائع ہوا تھا،جو کہ انتہائی مقبول ہوا۔

اردو شعری مجموعہ زادِ عشق بھی عوام وخواص میں بے حد پسند کیا گیا۔ان کی وفات پر ہمارے ایک شاعر نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بچھڑ گیا ہے وہ ہم سے مگر جدا تو نہیں
نظر سے دور ہوا ہے کہیں گیا تو نہیں

پاکستانی ادب اور صحافت پر قائم نقوی نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی اچانک موت ان کے اہل خانہ خصوصاً بیوی اور بچوں کے لئے تو بلاشبہ ایک ناقابل تلافی نقصان اور بہت بڑا المیہ ہے،ان کے ساتھ ساتھ ادب اور صحافت کے لئے بھی ان کی وفات ایک بڑے سرمائے سے محرومی کا سبب بنی ہے۔اہل قلم اپنے ایک انتہائی متحرک اور محبت بھرے تخلیق کار ساتھی کی اچانک رخصتی

پرسوگوار ہیں۔اپنی وفات سے کچھ دقیقے قبل قائم نقوی نے ریڈیو پاکستان پر امام عالی مقام حسین ابن علیؓ کی شان میں پنجابی کے یہ اشعار پڑھے۔محرم الحرام کے پہلے عشرے کی نسبت سے پیش کرتا ہوں۔

حسینؓ تیری صداقتاں نوں سلام میرا
حسینؓ تیری عبادتاں نوں سلام میرا
حسین تیرا نہ کوئی ثانی،توں پاک احمدؐ دی ہیں نشانی
تو حق دی راہ توں نہ مول ہٹیا
تو سر جھکایا نہ سر جو کٹیا
تو اپنے لہو نال اوہ دیوے بالے
جنہاں نے کیتے نے جگ اجالے
تو سچ دی بیڑی نوں تاریا اے
تو مر کے ویری نوں ماریا اے
تو دین جاپیں،ایمان جاپیں
تو پُنج نیزے قرآن جاپیں
دکھی نصیباں دی آس توں ایں
ازل ابد دی اثاث تو ایں
تو دین اسلام دا محافظ
سلام تیری سچائیاں نوں
سلام تیرے سپاہیاں نوں
سلام آکھاں میں شہداء نوں
سلام کربل دے وارثاں نوں

ستارے دیکھتے رہنا

شاعری کی روایت کم وبیش اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی انسان کے الفاظ کو ذریعہ اظہار بنانے کی تاریخ ہے، تین، چار ہزار سال پہلے کی بہت ساری شاعری تو ابھی تک کتابوں میں محفوظ ہے۔شاعر زمین کے ہر خطے ،نسل، رنگ وقوم اور مذہب کے لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔اس بابت میرا نظریہ یہ ہے بڑا شعر کوئی صوفی منش اور درویش صفت شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔اس کو یوں بھی کہنا چاہوں گا کہ ہمیشہ زندہ رہنے والے اشعار اور سدا بہار شاعری درویشانہ مزاج کے حامل سخن وروں کو ہی ودیعت ہوتی ہے۔ایسی ہی شاعری کی ایک کتاب میرے ایک سخن فہم دوست نے مجھے دی۔شیکسپئر نے تو کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے مگر میں اس بات کا قائل نہیں ہوں۔نام عنوان سے بہت سی باتیں اور بھید کھل جاتے ہیں۔کتاب کا نام ہے ''ستارے دیکھتے رہنا'' اور شاعر ہیں انجینئر ظفر محی الدین۔اس شعری مجموعے میں مجھے صوفیانہ رنگ چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کی ایک وجہ شائد ان کی خاندانی تربیت اور بچپن کا ماحول بھی ہوسکتی ہے،جس فضا میں ان کی پرورش ہوئی،وہ ایک طرف تو شعروسخن کے لئے سازگار تھی دوسرا تصوف سے ان کے گھرانے کا گہرا لگاؤ ہے۔اب تک ان کے شائع ہونے والے

پانچوں شعری مجموعوں میں عشق مجازی کی بات کرتے ہوئے بھی عشق حقیقی کی جھلک جگہ جگہ ملتی ہے۔ان کے ابتدائی شعری مجموعے ''کن داجوگی'' اور ''بھانبھڑ وچ سریر'' پنجابی زبان میں شائع ہوئے ،بعد میں تین اردو شعری مجموعوں کی اشاعت ہوئی ''درویش'' دیوان ظفر محی الدین'' اور ''عشق'' شائع

ہوئے، زبان کے تنوع کے باوجود ان کی شاعری کا بنیادی جوہر وہی رہا، جیسا کہ ان شعری مجموعوں کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ''ستارے دیکھتے رہنا'' انجینئر ظفر محی الدین کا چھٹا شعری مجموعہ ہے اور اس مجموعے میں شامل شاعری اپنے عنوان کی طرح نرم و نازک جذبات سے مزین ہے۔ عشق میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ ایسی شاعری جسے پڑھ کر سچل سرمست کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

عشق جنہاں دے اندر وڑیا

نظر تنہاں نوں آیا ہے

حمد و نعت سے آغاز اور پھر مولا علی کرم اللہ وجہہ کی خوبصورت منقبت کے بعد مرشد کے حضور ہدیہ تبریک ہماری شعری روایت سے شاعر کی آگہی اور اس سے جڑت کا پتہ دیتی ہے، عشق کی واردات سے انسان کی رنگت، رنگ، قبیلہ بدل جاتا ہے، نہ کسی سے دشمنی نہ کسی سے بیر۔ بس پیار ہی پیار اور خلوص رواں دواں رہتا ہے۔ یہی فلسفۂ عشق انجینئر ظفر محی الدین کا شعری نظریہ ہے جو ان کے تازہ شعری مجموعے میں آپ کو نظر آئے گا۔ ان کے نزدیک بے جان لفظوں کے اندر اپنے جذبات کی روح پھونکنے کا عمل شاعری ہے، جو کہ خواب دیکھنے جیسا عمل ہے۔ خوبصورت، دلفریب اور حیرت انگیز۔ ان دیکھی دنیاؤں کا سفر، نئے جہانوں کی تلاش اور اپنے اندر کی کھوج۔ من میں بسی مسلسل جستجو کا شعری بیان اس وقت ''ستارے دیکھتے رہنا'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ادبی حلقوں میں اکثر یہ تبصرہ سماعتوں سے ٹکراتا ہے کہ غزل کے دامن میں اب زیادہ گنجائش

نہیں بچی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حامی اس کی وجہ یہ گردانتے ہیں کہ دو، تین صدیوں سے اردو شاعری کو ذریعہ اظہار بنانے والے شعراء کرام نے عمومی طور پر غزل کی صنف سخن کا استعمال کیا ہے، کثرت استعمال سے شاید اس میں اب نئے موضوعات کا امکان کم ہے اور پھر عروض کا معاملہ درپیش رہتا ہے، قافیہ، ردیف سے بھی ہمارے بہت سے نو واردان نالان ہیں، انہیں وزن کی پابندیاں اظہار میں رکاوٹ اور محدودیت کا موجب نظر آتی ہیں۔ ایسے دوستوں کو میں ظفر محی الدین کی شاعری پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ بالخصوص وہ ''ستارے دیکھتے رہنا'' کا مطالعہ کریں تو انہیں احساس ہوگا کہ اردو غزل میں امکانات کا آفاق کتنا وسیع ہے اور موضوعات کا تنوع کیسے شعری قوس قزح میں ڈھالا جاتا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے

صبح پردہ کھینچا اس نے کمرے کا
روشنی سے روشنی ملنے لگی

جدیدیت، سہل ممتنع اور معنویت سے بھرپور مختصر بحر میں کیسا نیا خیال پیش کیا ہے

اب کوئی اور نہیں تیرے سوا میرا
اب تجھے چھوڑ کے جانے میں بڑی مشکل ہے

روح کی تاروں کو چھیڑتی غزلوں کے خوبصورت مجموعے کی اشاعت پر میں انجینئر ظفر محی الدین کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔امید ہے ''ستارے دیکھتے رہنا'' کی شعری رم جھم کے بعد بھی ان کا تخلیقی سفر یونہی محبتیں بکھیرتا ہوا جاری رہے گا۔آفسٹ کاغذ پر نہایت اعلیٰ طباعت ہے۔سرورق پر کیلی گرافی نعیم یادنے بہت ہی خوبصورت انداز میں کی ہے اور عمران شناور کی محنت وصلاحیت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔صفحات کی تعداد 272 ہے اور قیمت 2100 روپے ہے۔اس خوبصورت شعری مجموعے کو نستعلیق پبلشرز نے اردو بازار لاہور سے شائع کیا ہے۔قادری نوشاہی سچیاری سلسلے کے صوفی بزرگ کے ہاں 1961 میں فیصل آباد جو کہ تب لائل پور تھا میں پیدا ہونے والے ظفر محی الدین کی توانا اور چونکا دینے والی شاعری کا یہ مجموعہ تاریخ میں زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔

ظفر دل والا

جاپان میں بسلسلۂ روزگار آنے والے تارکین وطن عمومی طور پر تنگ دستی کے عالم میں ہی یہاں پہنچتے ہیں اور ابتدائی ماہ وسال مزدوری ومحنت کشی میں گزارتے ہیں۔ظفر حنیف کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔جاپان آنے کے بعد پہلے تین روز اس نے ٹوکیو کے مہنگے ترین فائیو سٹار ہوٹل پرنس میں گزارے تھے۔اس کے بعد سکونت کا مناسب انتظام ہوگیا تو ذاتی رہائش گاہ میں منتقل ہوگیا۔اصل بات تو یہ ہے کہ میں نے اس سے ایک بار عہد کیا تھا، وعدہ تو اس سے میرا یہ تھا کہ دل ریستوران پر پورا مضمون لکھوں گا، جس ہوٹل کا وہ بانی اور روح رواں تھا، مگر بدقسمتی سے وعدہ وفا یوں ہو رہا ہے کہ اس دوست کا تعزیت نامہ لکھ رہا ہوں۔ بڑا دلیر آدمی تھا۔خوف کی ہڈی اس کے پورے جسم میں ایک بھی نہیں تھی، شومئی قسمت کہ ہڈیوں کے کینسر میں مبتلا ہوگیا۔سبز آنکھوں، گھنی زلفوں، دراز قد والے ظفر جیسے وجیہہ اور خوبصورت پاکستانی جاپان میں کم کم ہی پہنچے ہیں۔اگر شوبز میں چلا جاتا تو یقیناً ایک مقبول ہیرو کے طور پر پہچان بنالیتا۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ ایک عام آدمی تھا، مگر یقین کیجئے قدرت کے اس کارخانے میں کوئی انسان بھی عمومی نہیں، ہر آدمی ہی خاص ہے، اور پھر میرا دوست تو بہت ہی خاص تھا۔باقی یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ کوئی مشہور اور مقبول شخصیت نہیں تھا، پھر بھی بے مثال تھا۔

اس کی ازدواجی زندگی بڑے نشیب وفراز کا شکار رہی۔پہلی بیوی جاپانی اس کے بعد متعدد بار شادیاں کیں، ان میں بچے بھی پیدا ہوئے۔مگر بات نبھی نہیں۔اس کی زندگی اس شعر کے

مصداق تھی کہ

انجمن انجمن شناسائی
پھر بھی دل کا نصیب تنہائی

اس ناآسودہ ازدواجی زندگی کی وجوہات میں ظفر کی غصیلی طبیعت کا دخل بھی تھا،مگر بنیادی طور پر وہ بڑا ہی محبت کرنے والا آدمی تھا۔آخری بیوی جس کا تعلق مشرقی یورپ سے تھا،اسے تو ظفر کے دونوں بچوں نے قبول نہیں کیا تھا،بات سمجھ میں بھی آنے والی ہے۔جب ایک فریق کے انتخاب تک نوبت آ گئی تو پھر ہمارے دوست نے اپنے بیٹے دانیال اور بیٹی کا انتخاب کیا۔شاید عجیب لگے مگر میرا اصرار تھا کہ ظفر کو پاکستان شادی کر لینی چاہیئے۔اس کا والد بھی میرا ہم خیال تھا کہ رشتہ ازدواج پاکستانی لڑکی سے ہی بننا چاہیئے۔میں نے تو ایک رشتہ بھی اس کے لئے تلاش کر لیا تھا۔کیا خبر تھی کہ پیغام اجل آیا چاہتا ہے۔اپنے ریستوران میں ہر وقت رونق لگائے رکھتا تھا،مجلسی آدمی تھا۔گرچہ معاشی حالات اس کے بھی زیادہ اچھے نہیں تھے،پھر بھی اس کی طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی۔بڑے کھلے دل کا آدمی تھا۔پاکستانیوں کی آمدورفت نے ایسی رونق بنا رکھی تھی کہ ہوٹل ہذا دیسی کلب کی شکل اختیار کر چکا تھا،بابا بلھے شاہؒ کے اس مصرعے کی عملی تفسیر تھا کہ

اِٹ کھڑکے،دکڑوجے،تتا ہووے چولھا

جلالی طبیعت اور لاابالی پن کے سبب دوستوں کے ساتھ ساتھ ظفر کو دشمنوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔بات اب سمجھ آتی ہے کہ اس کے غصیلے رویے کی وجہ بنیادی طور پر اس کی بیماری تھی،پھر مستقل بلند فشار خون نے اس کی طبیعت ایسی بنا دی تھی کہ ایک ریستوران چلانے والے آدمی کے لئے موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔ریستوران کو کامیابی سے چلانے کے لئے تو جان پرسوز سے زیادہ سخن دل نواز درکار ہوتا ہے مگر ہمارے ممدوح کے ہاں معاملہ الٹا تھا۔دل کا بہت صاف تھا،شاید اسی لئے

کاروباری ادارے کا نام بھی شاعرانہ رکھ چھوڑا تھا۔ بدخواہوں کا کہنا ہے کہ اپنے ابتدائی برسوں میں جب اس کا کاروبار جاپانی گاڑیوں کی ایکسپورٹ کے متعلق تھا اور اس کے پاس بہت پیسہ، روپیہ تھا، تب بھی ایسی ہی قہر آلود طبیعت کا مالک تھا۔ غیر قانونی طور پر جاپان میں مقیم نوجوانوں سے اپنی ٹانگیں دبواتا اور چانپی کرواتا تھا۔ اپنے کاروباری عروج کے زمانے میں ایک ہائی ایس گاڑی رکھی ہوئی تھی جس کی پچھلی نشستوں پر لیٹ جاتا اور لڑکے اس کی ٹانگیں دباتے تھے۔ سچ مگر یہ ہے کہ وہ بڑی حساس طبیعت کا انتہائی نرم دل انسان تھا۔ ہمیشہ دوسرے لوگوں کے کام آنے والا۔ بڑا ہی بے لوث انسان تھا مگر منہ پھٹ تھا۔ جوانی میں ہی داغ مفارقت دے گیا۔ آخری ملاقات میں کہنے لگا کہ میرے بیٹے دانیال کا خیال رکھنا۔ ٹوکیو کے نواح میں اس کی تدفین کی گئی۔ ہم نام ہونے کے سبب شائد، مغلیہ سلطنت کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا یہ شعر بار بار دماغ میں گونجتا ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دوگز زمین مل نہ سکی کوئے یار میں

پھر شیخ سعدی شیرازی یاد آ گئے، اپنی عہد ساز اور ہمیشہ زندہ رہنے والی تصنیف گلستان میں لکھتے ہیں کہ جب روح کا جسم سے نکلنے کا وقت آ پہنچے، تو پھر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جان شاہی تخت پر نکلتی ہے، یا پھر جسد خاکی خاک اور مٹی میں پڑا ہو جب جان جان آفرین کے سپرد کرتے ہیں۔ سارے شہر کو ویران کر جانا کہوں تو شاید شاعرانہ مبالغہ لگے مگر ظفر دل والا جاپان کے ساحلی شہر تویاما کی کئی محفلوں کو سونا اور پھیکا ضرور کر گیا ہے۔ ذاتی نقصان یوں کہوں گا کہ دیار غیر میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ کے سبب حلقۂ احباب تو سبھی پردیسیوں کا مختصر ہی ہوتا ہے، کسی ایک عزیز دوست کی رخصتی بھی ایسے عالم میں مرگِ انبوہ کا منظر دکھائی دیتی ہے۔

Amir Bin Ali is residing in Japan from last many years and a frequent international traveler. He is an optimistic writer. He realizes all the shortcomings of Pakistani society but also has a firm belief that Pakistan has all the resources and a talented workforce to make remarkable progress, though we are lack of the necessary environment required to lead us toward becoming one of the most developed nations. Amir Bin Ali has been expressing his thoughts, feelings and observations in his Newspaper columns. These columns depict different aspects of life in Japan, Latin America and other parts of the world quite brilliantly and readers have been benefiting from these columns but obviously, a newspaper has a very short span of life...it is an excellent decision to print these columns collectively in a book. Maybe, after reading this book, a few people will decide that we should learn something from the other nations to start the journey towards progress.

Dr. Amjad Pervez

مصنف کی دیگر تصانیف

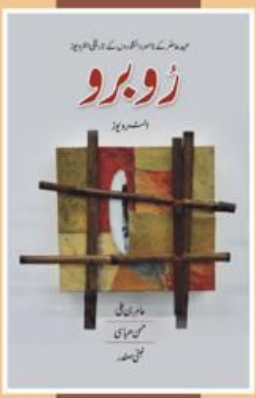

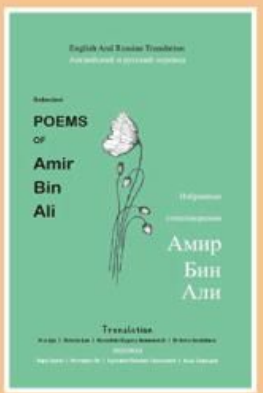

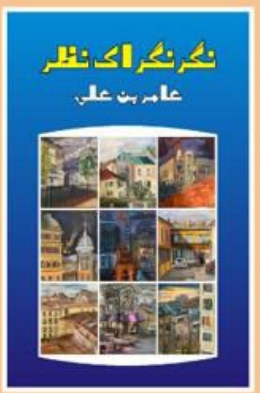

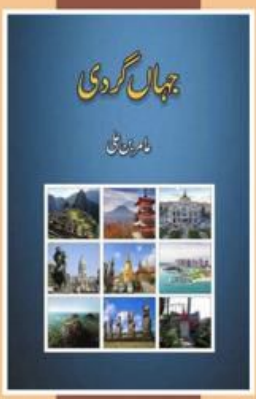

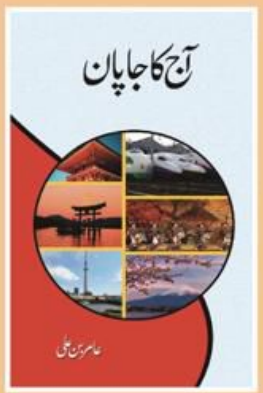

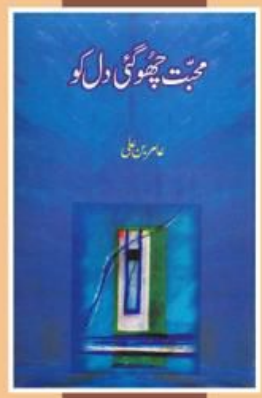

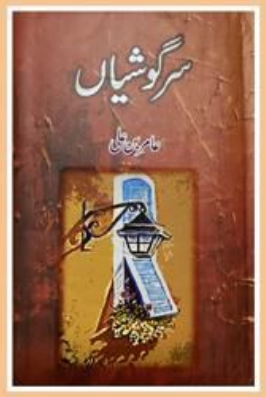

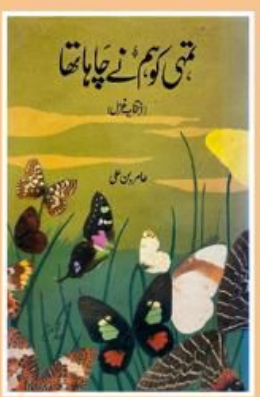

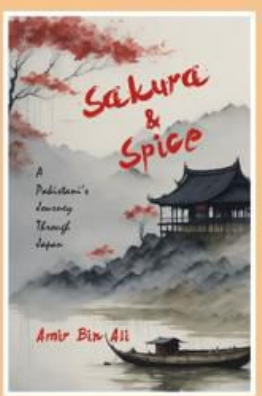

Amir Bin Ali is one of the finest poets from the Younger Generation that Have Emerged During the Last Decade
(Express Tribune) *Book Review*

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search Of New Sights & Experiences. He has Written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books Of Interviews With Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expert in Seven international Languages
(Daily Times) *Book Review*

عامر بن علی کا قلمی سفر

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ۔ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوبِ جاپان (زیرِ طبع)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (شعری مجموعہ)
- گردِ سفر (کالمز)
- روبرو (انٹرویوز)
- Избранные стихотворения Амир Бин Али **Selected Poems of Ami Bin Ali**
- جہاں گردی (سفرنامہ)
- نگر نگر اک نظر (سفرنامہ)
- مدیرِ اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور
- (A Pakistani's Journey Through Japan) **Sakura & Spice**

ISBN 978-969-544-231-9
9 789695 442319

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com